کلیاتِ حبیب جالب

حبیب جالبؔ

فہرست

-303 حبیب جالب فلم نگر میں

○

دل کی بات لبوں پر لاکر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

بیت گیا ساون کا مہینہ، موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا، جن کے لئے بدنام ہوئے
آج وہی ہم سے بیگانے بیگانے سے رہتے ہیں

وہ جو ابھی اس راہ گزر سے چاک گریباں گزرا تھا
اس آوارہ دیوانے کو جالبؔ جالبؔ کہتے ہیں

ں

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں
اڑتے پتّوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے، فتنہ گر لوگ تھے
زخم کھاتا رہا مُسکراتا رہا، شوقِ آوارگی

کوئی پیغام گل تک نہ پہنچا مگر پھر بھی شام و سحر
ناز بادِ چمن کے اٹھاتا رہا شوقِ آوارگی

کوئی ہنس کے ملے غنچۂ دل کھلے چاک دل کا سلے
ہر قدم پر نگاہیں بچھاتا رہا، شوقِ آوارگی

دشمنِ جاں فلک، غیر ہے یہ زمیں کوئی اپنا نہیں
خاک سارے جہاں کی اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

○

ہم آوارہ گاؤں گاؤں بستی بستی پھرنے والے
ہم سے پریت بڑھا کر کوئی مفت میں کیوں غم کو اپنا لے

یہ بھیگی بھیگی برساتیں، یہ مہتاب یہ روشن راتیں
دل ہی نہ ہو تو جھوٹی باتیں کیا اندھیارے کیا اجیالے

غنچے روئیں کلیاں روئیں، رو رو اپنی آنکھیں کھوئیں
چین سے لمبی تان کے سوئیں اس پھلواری کے رکھوالے

درد بھرے گیتوں کی مالا جپتے جپتے جیون گزرا
کس نے سُنی ہیں کون سُنے گا دل کی باتیں، دل کے نالے

○

یہ اور بات تیری گلی میں نہ آئیں ہم
لیکن یہ کیا کہ شہر ترا چھوڑ جائیں ہم

مدّت ہوئی ہے کوئے بتاں کی طرف گئے
آوارگی سے دل کو کہاں تک بچائیں ہم

شاید بقیدِ زیست یہ ساعت نہ آ سکے
تم داستانِ شوق سنو اور سُنائیں ہم

بے نور ہو چکی ہے بہت شہر کی فضا
تاریک راستوں میں کہیں کھو نہ جائیں ہم

اُس کے بغیر آج بہت جی اُداس ہے
جالبؔ چلو کہیں سے اُسے ڈھونڈ لائیں ہم

○

پھر کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
ہم ترا شہر چھوڑ جائیں گے

دُور افتادہ بستیوں میں کہیں
تیری یادوں سے لو لگائیں گے

شمعِ ماہ و نجوم گل کر کے
آنسوؤں کے دیئے جلائیں گے

آخری بار اک غزل سُن لو
آخری بار ہم سنائیں گے

صورت موجہ ہوا جالبؔ
ساری دنیا کی خاک اڑائیں گے

○

محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
ترے شہر میں اک جہاں چھوڑ آئے

پہاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی
جہاں ہم دلِ نغمہ خواں چھوڑ آئے

وہ سبزہ، وہ دریا، وہ پیڑوں کے سائے
وہ گیتوں بھری بستیاں چھوڑ آئے

حسیں پنگھٹوں کا وہ چاندی سا پانی
وہ برکھا کی رت وہ سماں چھوڑ آئے

بہت دُور ہم آگئے اس گلی سے
بہت دُور وہ آستاں چھوڑ آئے

○

بہت مہرباں تھیں وہ گلپوش راہیں
مگر ہم انہیں مہرباں چھوڑ آئے

بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے ہیں
نشیمن سرِ گلستاں چھوڑ آئے

یہ اعجاز ہے حُسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

چلے آئے ان رہگزاروں سے جالبؔ
مگر ہم وہاں قلب و جاں چھوڑ آئے

○

لوگ گیتوں کا نگر یاد آیا
آج پردیس میں گھر یاد آیا

جب چلے آئے چمن زار سے ہم
التفاتِ گلِ تر یاد آیا

تیری بیگانہ نگاہی سرِ شام
یہ ستم تابہ سحر یاد آیا

ہم زمانے کا ستم بھول گئے
جب ترا لطفِ نظر یاد آیا

تو بھی مسرور تھا اس شب سرِ بزم
اپنے شعروں کا اثر یاد آیا

پھر ہوا دردِ تمنّا بیدار
پھر دل خاک بسر یاد آیا

ہم جسے بھول چکے تھے جالبؔ
پھر وہی راہ گزر یاد آیا

○

جاگ اٹھے سوئے ہوئے درد تمناؤں کے
راستے ذہن میں لہرا گئے اس گاؤں کے

اک تری یاد سے اک تیرے تصور سے ہمیں
آ گئے یاد کئی نام حسیناؤں کے

صبح سے شام تلک گرم ہوا چلتی ہے
دن بہت سخت ہیں، تپتے ہوئے صحراؤں کے

اس کڑی دھوپ میں یاد آتے ہیں تڑپاتے ہیں
ہم کو احسان درختوں کی گھنی چھاؤں کے

وہ حسیں پھول، وہ سبزہ وہ فسوں ساز دیار
وہ مدھر گیت محبت بھرے دریاؤں کے

جانے کس حال میں ہیں، کون بتائے جالبؔ
ارض پنجاب میں پودے میری آشاؤں کے

○

اس دیس کا رنگ انوکھا تھا' اس دیس کی بات نرالی تھی
نغموں سے بھرے دریا تھے رواں گیتوں سے بھری ہریالی تھی

اس شہر سے ہم آجائیں گے اشکوں کے دیپ جلائیں گے
یہ دور بھی آنے والا تھا یہ بات بھی ہونے والی تھی

وہ روشن گلیاں یاد آئیں' وہ پھول وہ کلیاں یاد آئیں
سندر من چلیاں یاد آئیں' ہر آنکھ مدھر متوالی تھی

کس بستی میں آپہنچے ہم ہر گام پہ ملتے ہیں سو غم
پھر چل اس نگری میں ہمدم ہر شام جہاں اُجیالی تھی

وہ بام و در وہ راہگزر' دل خاک بسر جاں خاک بسر
جالبؔ وہ پریشاں حالی بھی کیا خوب پریشاں حالی تھی

○

ہر گام پر تھے شمس و قمر اُس دیار میں
کتنے حسیں تھے شام و سحر اُس دیار میں

وہ باغ وہ بہار، وہ دریا وہ سبزہ زار
نشوں سے کھیلتی تھی نظر اُس دیار میں

آسان تھا سفر کہ ہر اِک راہگزار پر
ملتے تھے سایہ دار شجر اُس دیار میں

ہر چند تھی وہاں بھی خزاں کی اداس دھوپ
دل پر نہیں تھا غم کا اثر اُس دیار میں

محسوس ہو رہا تھا ستارے ہیں گرد راہ
ہم تھے ہزار خاک بسر اُس دیار میں

جالب یہاں تو بات گریباں تک آ گئی
رکھتے تھے صرف چاکِ جگر اُس دیار میں

○

پھر دل سے آرہی ہے صدا اس گلی میں چل
شاید ملے غزل کا پتا اس گلی میں چل

کب سے نہیں ہوا ہے کوئی شعر کام کا
یہ شعر کی نہیں ہے فضاء اس گلی میں چل

وہ بام و در وہ لوگ وہ رسوائیوں کے زخم
ہیں سب کے سب عزیز جدا اس گلی میں چل

اس پھول کے بغیر بہت جی اداس ہے
مجھ کو بھی ساتھ لے کر صبا اس گلی میں چل

دنیا تو چاہتی ہے یونہی فاصلے رہیں
دنیا کے مشوروں پہ نہ جا اس گلی میں چل

بے نور و بے اثر ہے یہاں کی صدائے ساز
تھا اس سکوت میں بھی مزار اس گلی میں چل

جالب پکارتی ہیں وہ شعلہ نوائیاں
یہ سرد رت یہ سرد ہوا' اس گلی میں چل

○

بجلیوں کی یورش سے شاخ شاخ لرزاں ہے
کیا یہی بہاراں ہے کیا یہی گلستاں ہے

آج بھی نگاہوں سے وحشتیں نہیں جاتیں
آج بھی نگاہوں میں کائنات ویراں ہے

تیرے گیسوؤں ہی پر میری جاں نہیں موقوف
ذرّہ ذرّہ ہستی کا آج کل پریشاں ہے

مل ہی جائے گی منزل کٹ ہی جائے گی مشکل
اے مرے نئے ساتھی کس لئے ہراساں ہے

○

گُلشن کی فضاء دُھواں دُھواں ہے
کہتے ہیں بہار کا سماں ہے

بکھری ہوئی پتّیاں ہیں گُل کی
ٹوٹی ہوئی شاخِ آشیاں ہے

جس دل سے ابھر رہے تھے نغمے
پہلو میں وہ آج نوحہ خواں ہے

ہم ہی نہیں پائمال تنہا
اے دوست! تباہ اک جہاں ہے

جالبؔ وہ کہاں ہے عشق تیرا
پیارے وہ غزل تری کہاں ہے

○

مہتاب صفت لوگ یہاں خاک بسر ہیں
ہم محو تماشائے سرِ راہ گزر ہیں

حسرت سی برستی ہے درو بام پہ ہر سو
روتی ہوئی گلیاں ہیں سسکتے ہوئے گھر ہیں

آئے تھے یہاں جن کے تصور کے سہارے
وہ چاند' وہ سورج وہ شب و روز کدھر ہیں

سوئے ہو گھنی زلف کے سائے میں ابھی تک
اے راہ رواں کیا یہی اندازِ سفر ہیں

وہ لوگ قدم جن کے لئے کاہکشاں نے
وہ لوگ بھی اے ہمنفسو ہم سے بشر ہیں

بِک جائیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سر بازار
ہم یوسفِ کنعاں ہیں نہ ہم لعل و گہر ہیں

ہم لوگ ملیں گے تو محبت سے ملیں گے
ہم نزہتِ مہتاب ہیں ہم نورِ سحر ہیں

○

شہر ویراں اداس ہیں گلیاں
رہگزاروں سے اٹھ رہا ہے دھواں

آتشِ غم میں جل رہے ہیں دیار
گرد آلود ہے رُخِ دُوراں

بستیوں پر غموں کی یورش ہے
قریہ قریہ ہے وقفِ آہ و فغاں

صبح بے نور، شام بے مایہ
لُٹ گئی دولتِ نگاہ کہاں

پھر رہے ہیں طیُور آوارہ
برق ہر شاخ پر ہے شعلہ فشاں

میری تنہائیوں پہ صورتِ شمع
رو رہا ہے الم نصیب سماں

میرے شانوں سے تیری زلفوں تک
فاصلہ عمر کا ہے میری جاں

○

اگر دامن نہیں ان کا میسّر
کسی دیوار ہی سے لگ کے رو لیں

مِلے رونے سے فرصت تو کسی شب
ستاروں کی حسیں چھاؤں میں سو لیں

نگاہوں کی زباں کوئی جو سمجھے
سر محفل کبھی ہم لب نہ کھولیں

بہت آسان ہو جائے گی منزل
چلو ہم ہی کسی کے ساتھ ہو لیں

کوئی جو آ بسے دل میں تو جالبؔ
کبھی اس گھر کے دروازے نہ کھولیں

○

اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

یہ ہنستا ہوا چاند یہ پُر نور ستارے
تابندہ و پائندہ ہیں ذرّوں کے سہارے

حسرت ہے کوئی غنچہ ہمیں پیار سے دیکھے
ارماں ہے کوئی پھول ہمیں دل سے پکارے

ہر صبح مری صبح پہ روتی رہی شبنم
ہر رات مری رات پہ ہنستے رہے تارے

کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غمِ جاناں
کب تک کوئی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے

○

ہم نے سُنا تھا صحنِ چمن میں کیف کے بادل چھائے ہیں
ہم بھی گئے تھے جی بہلانے اشک بہا کر آئے ہیں

پھول کھلے تو دل مرجھائے شمع جلے تو جان جلے
ایک تمہارا غم اپنا کر کتنے غم اپنائے ہیں

ایک سُلگتی یاد، چمکتا درد، فروزاں تنہائی
پوچھ نہ اس کے شہر سے ہم کیا کیا سوغاتیں لائے ہیں

سوئے ہوئے جو درد تھے دل میں آنسو بن کر بہ نکلے
رات ستاروں کی چھاؤں میں یاد وہ کیا کیا لائے ہیں

آج بھی سورج ڈوب گیا بے نور افق کے ساگر میں
آج بھی پھول چمن میں تجھ کو بن دیکھے مرجھائے ہیں

ایک قیامت کا سناٹا، ایک بلا کی تاریکی
اُن گلیوں سے دور نہ ہنستا چاند نہ روشن سائے ہیں

پیار کی بولی بول نہ جالبؔ اس بستی کے لوگوں سے
ہم نے سکھ کی کلیاں کھو کر دکھ کے کانٹے پائے ہیں

○

جب کوئی کلی صحن گلستاں میں کھلی ہے
شبنم مری آنکھوں میں وہیں تیر گئی ہے

جس کی سر افلاک بڑی دھوم مچی ہے
آشفتہ سری ہے، مری آشفتہ سری ہے

اپنی تو اجالوں کو ترستی ہیں نگاہیں
سورج کہاں نکلا ہے، کہاں صبح ہوئی ہے

ہم کشمکش دیر و حرم سے ہیں بہت دُور
انسان کی عظمت پہ نظر اپنی رہی ہے

بچھڑی ہوئی راہوں سے جو گزرے ہیں کبھی ہم
ہر گام پہ کھوئی ہوئی اک یاد ملی ہے

اک عُمر سُنائیں تو حکایت نہ ہو پوری
دو روز میں ہم پر جو یہاں بیت گئی ہے

تم سادہ و معصوم ہو اور ہم ہیں گنہگار
دنیا کی نگاہوں سے کہیں بات چھپی ہے

ہنسنے پہ نہ مجبور کرو، لوگ ہنسیں گے
حالات کی تفسیر تو چہرے پہ لکھی ہے

دیکھا ہے زمانے کو گلے ہم نے لگا کر
سینہ تری دنیا کا محبت سے تہی ہے

وہ بھول گئے ہم کو، انہیں بھول گئے ہم
اے دوست مگر دل میں خلش اب بھی وہی ہے

مل جائیں کہیں وہ بھی تو ان کو بھی سنائیں
جالبؔ یہ غزل جن کے لئے ہم نے کہی ہے

○

کبھی تو مہرباں ہو کر بُلا لیں
یہ مہوش ہم فقیروں کی دُعا لیں

نہ جانے پھر یہ رت آئے نہ آئے
جواں پھولوں کی کچھ خوشبو چرا لیں

بہت روئے زمانے کے لئے ہم
ذرا اپنے لئے آنسو بہا لیں

ہم ان کو بھولنے والے نہیں ہیں
سمجھتے ہیں غمِ دوراں کی چالیں

ہماری بھی سنبھل جائے گی حالت
وہ پہلے اپنی زلفیں تو سنبھالیں

نکلنے کو ہے وہ مہتاب گھر سے
ستاروں سے کہو نظریں جھکا لیں

ہم اپنے راستے پر چل رہے ہیں
جنابِ شیخ اپنا راستہ لیں

زمانہ تو یونہی روٹھا رہے گا
چلو جالبؔ انہیں چل کر منا لیں

○

سونی ہیں آنکھوں کی گلیاں دل کی بستی ویراں ہے
ایک خموشی ایک اندھیرا چاروں جانب رقصاں ہے

کتنی دور چلا آیا ہوں چھوڑ کے تیری بستی کو
لیکن دل تیری گلیوں میں آج تلک سرگرداں ہے

پھر سورج کے ساتھ ترے ملنے کا امکاں ڈوب گیا
پھر بام و در کی تاریکی دیدہ و دل پر خنداں ہے

پھر ان پیار بھری ندیوں کی یاد میں آنکھیں پُرنم ہیں
پھر اس بچھڑے دیس کے غم میں شہرِ دل و جاں ویراں ہے

جالبؔ آپ اس جانِ غزل کے پیار سے لاکھ انکار کریں
آنکھوں کی پر سوز چمک سے دل کا درد نمایاں ہے

○

وہ جن کی رفعتوں کے سامنے ہے گرد آسماں
ترے دیار میں ہیں صورت متاعِ رائیگاں

یہیں ٹھہر یہیں ٹھہر، میں آرہا ہوں میری جاں
بلا رہا ہے اک ذرا سی دیر کو غمِ جہاں

فریب رنگ و بو نہ کھا ابھی چمن، چمن کہاں
ابھی تو شاخ شاخ پر چمک رہی ہیں بجلیاں

چلو دیارِ نغمہ و شباب میں پناہ لیں
سمٹ کے آگئی ہیں دِل میں سب جہاں کی تلخیاں

چلو غزل کے شہر میں چلو طرب کے دیس میں
چلو نگاہ کو نِگاہ کی سنائیں داستاں

○

دل والو کیوں دل سی دولت یوں بیکار لٹاتے ہو
کیوں اس اندھیاری بستی میں پیار کی جوت جگاتے ہو

تم ایسا نادان جہاں میں کوئی نہیں ہے کوئی نہیں
پھر ان گلیوں میں جاتے ہو پگ پگ ٹھوکر کھاتے ہو

سندر کلیو، کومل پھولو یہ تو بتاؤ یہ تو کہو
آخر تم میں کیا جادو ہے کیوں من میں بس جاتے ہیں

یہ موسم رم جھم کا موسم، یہ برکھا یہ مست فضاء
ایسے میں آؤ تو جانیں، ایسے میں کب آتے ہو

ہم سے روٹھ کے جانے والو اتنا بھید بتا جاؤ
کیوں نت راتوں کو سپنوں میں آتے ہو من جاتے ہو

چاند ستاروں کے جھرمٹ میں پھولوں کی مسکاہٹ میں
تم چھپ چھپ کر ہنستے ہو تم روپ کا مان بڑھاتے ہو

چلتے پھرتے روشن رستے تاریکی میں ڈوب گئے
سو جاؤ اب جالب تم بھی کیوں آنکھیں سلگاتے ہو

O

میں چُپ ہوں ذرا ڈوبتے خورشید سے پوچھو
کِس کرب سے کس حال میں کس طور کٹا دن

لو آج بھی کم ہو نہ سکی یاس کی ظلمت
لو آج بھی بیکار گیا آس بھرا دن

یہ شہر جہاں ہم ہیں یہاں کون ہے اپنا
یہ بات ہی کیا کم ہے یہاں بیت گیا دن

یہ کون سی بستی ہے جہاں چاند نہ سورج
کس درجہ بُری رات ہے کس درجہ بُرا دن

ظلمت کدۂ زیست میں پھر دیکھیے کب آئے
تیرے لب و رخسار سے شرمایا ہُوا دن

اس شہر سے دور آکے جو دن دیکھ رہے ہیں
دشمن کو بھی ایسے تو دکھائے نہ خدا دن

○

کیا کیا لوگ گزر جاتے ہیں رنگ برنگی کاروں میں
دل کو تھام کے رہ جاتے ہیں دل والے بازاروں میں

یہ بے درد زمانہ ہم سے تیرا درد نہ چھین سکا
ہم نے دل کی بات کہی ہے تیروں میں تلواروں میں

ہونٹوں پر آہیں کیوں ہوتیں آنکھیں نسدن کیوں روتیں
کوئی اگر اپنا بھی ہوتا اونچے عہدیداروں میں

صدر محفل داد جسے دے داد اسی کو ملتی ہے
ہائے کہاں ہم آن پھنسے ہیں ظالم دنیا داروں میں

رہنے کو گھر بھی مل جاتا چاکِ جگر بھی سل جاتا
جالبؔ تم بھی شعر سناتے جا کے اگر درباروں میں

○

کٹی اب کٹی منزل شام غم
بڑھائے چلو پاؤں گارو قدم
ہمیں سے فروزاں ہے شمع وفا
ہمیں نے بھرا ہے محبت کا دم
کہیں یاس کے حوصلے بڑھ نہ جائیں
کہیں آس کے رک نہ جائیں قدم
پڑھے گا زمانہ بڑے شوق سے
کیے جاؤں دل کی کہانی رقم
بدل جائے گا دیکھتے دیکھتے
یہ عہد خرابی' یہ عہد ستم
نکلنے کو ہے آفتاب سحر
شب تار ہے بس کوئی اور دم

مٹا کر اندھیروں کا نام و نشاں
اجالوں کی بستی بسائیں گے ہم

○

شب کو چاند اور دن کو سورج بن کر روپ دکھاتی ہو
پل چھن آنکھوں کی گلیوں میں تم آنچل لہراتی ہو

تم سے جگ اجیارا سارا روشن بستی بستی ہے
سانجھ سویرے ڈیرے ڈیرے جیون جوت جگاتی ہو

کتنی روشن ہے تنہائی جب سے یہ معلُوم ہُوا
میرے لئے اپنی پلکوں پر تم بھی دیپ جلاتی ہو

اے میری انمول غزل یہ بات بھی مجھ تک پہنچی ہے
یارانِ لاہور میں اب تک تم میری کہلاتی ہو

میرؔ ہو غالبؔ ہو یا جالبؔ گیت تمہارے گاتے ہیں
شب کے شعروں میں تم اپنی سندر چھب دکھلاتی ہو

○

اب تیری ضرورت بھی بہت کم ہے مری جاں
اب شوق کا کچھ اور ہی عالم ہے مِری جاں

اب تذکرۂ خندۂ گل بار ہے جی پر
جاں وقفِ غمِ گریہ شبنم ہے مِری جاں

رُخ پر ترے بکھری ہوئی یہ زلفِ سیہ تاب
تصویرِ پریشانئ عالم ہے مِری جاں

یہ کیا کہ تجھے بھی ہے زمانے سے شکایت
یہ کیا کہ تری آنکھ بھی پُرنم ہے مِری جاں

ہم سادہ دلوں پر یہ شبِ غم کا تسلّط
مایوس نہ ہو اور کوئی دم ہے مِری جاں

یہ تیری توجّہ کا ہے اعجاز کہ مجھ سے
ہر شخص ترے شہر کا برہم ہے مِری جاں

اے نزہتِ مہتاب ترا غم ہے مِری زیست
اے نازشِ خورشید ترا غم ہے مِری جاں

○

تُو رنگ ہے غبار ہیں تیری گلی کے لوگ
تو پھول ہے شرار ہیں تیری گلی کے لوگ

تو رونقِ حیات ہے تو حُسنِ کائنات
اجڑا ہوا دیار ہیں تیری گلی کے لوگ

تو پیکرِ وفا ہے مجسّم خلوص ہے
بدنامِ روزگار ہیں تیری گلی کے لوگ

روشن ترے جمال سے ہیں مہر و ماہ بھی
لیکن نظر پہ بار ہیں تیری گلی کے لوگ

دیکھو جو غور سے تو زمیں سے بھی پست ہیں
یوں آسماں شکار ہیں تیری گلی کے لوگ

پھر جارہا ہوں تیرے تبسّم کو لوٹ کر
ہر چند ہوشیار ہیں تیری گلی کے لوگ

کھو جائیں گے سحر کے اجالوں میں آخرش
شمع سرِ مزار ہیں تیری گلی کے لوگ

یہ اُجڑے باغ ویرانے پرانے
سناتے ہیں کچھ افسانے پرانے

اک آہ سرد بن کر رہ گئے ہیں
وہ بیتے دن وہ یارانے پرانے

جنوں کا ایک ہی عالم ہو کیونکر
نئی ہے شمع پروانے پُرانے

نئی منزل کی دشواری مسلّم
مگر ہم بھی ہیں دیوانے پرانے

ملے گا پیار غیروں ہی میں جالبؔ
کہ اپنے تو ہیں بیگانے پُرانے

○

شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی مشینوں میں

پیار کی روشنی نہیں ملتی
ان مکانوں میں ان مکینوں میں

دیکھ کر دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ
سانپ ہوتے ہیں آستینوں میں

قہر کی آنکھ سے نہ دیکھ ان کو
دل دھڑکتے ہیں آبگینوں میں

آسمانوں کی خیر ہو یارب
اک نیا عزم ہے زمینوں میں

وہ محبت نہیں رہی جالبؔ
ہم صفیروں میں ہم نشینوں میں

○

اس نے جب ہنس کے نمسکار کیا
مجھ کو انسان سے اوتار کیا

دشتِ غربت میں دلِ ویراں نے
یاد جمنا کو کئی بار کیا

پیار کی بات نہ پوچھو یارو
ہم نے کس کس سے نہیں پیار کیا

کتنی خوابیدہ تمناؤں کو
اس کی آواز نے بیدار کیا

ہم پجاری ہیں بتوں کے جالبؔ
ہم نے کعبے میں بھی اقرار کیا

○

ماورائے جہاں سے آئے ہیں
آج ہم خُمستاں سے آئے ہیں

اس قدر بے رُخی سے بات نہ کر
دیکھ تو ہم کہاں سے آئے ہیں

ہم سے پوچھو چمن پہ کیا گزری
ہم گزر کر خزاں سے آئے ہیں

راستے کھو گئے ضیاؤں میں
یہ ستارے کہاں سے آئے ہیں

اس قدر تو بُرا نہیں جالبؔ
مل کے ہم اس جواں سے آئے ہیں

○

عشق میں نام کر گئے ہوں گے
جو ترے غم میں مر گئے ہوں گے

اب وہ نظریں اِدھر نہیں اُٹھتیں
ہم نظر سے اُتر گئے ہوں گے

کچھ فضاؤں میں انتشار سا ہے
ان کے گیسو بکھر گئے ہوں گے

نور بکھرا ہے رہ گزاروں میں
وہ اِدھر سے گزر گئے ہوں گے

میکدے میں کہ بزمِ جاناں تک
اور جالبؔ کدھر گئے ہوں گے

○

آج پھر تم نظر نہیں آئے
پھر تمنا کے پھول مرجھائے

آج پھر سوگوار آنکھوں نے
لالہ و گل پہ اشک برسائے

آج پھر عہدِ غم کے افسانے
میری بے تابیوں نے دہرائے

اس بھرے شہر میں تمہارا پتہ
کس کو معلوم کون بتلائے

کن دیاروں میں کھو گئے ہو تم
ہم ستاروں کی خاک چھان آئے

○

کون بتائے کون سمجھائے کون سے دیس سدھار گئے
ان کا رستہ تکتے تکتے نین ہمارے ہار گئے

کانٹوں کے دکھ سہنے میں تسکین بھی تھی آرام بھی تھا
ہنسنے والے بھولے بھالے پھول چمن کے مار گئے

ایک لگن کی بات ہے جیون ایک لگن ہی جیون ہے
پوچھ نہ کیا کھویا کیا پایا کیا جیتے کیا ہار گئے

آنے والی برکھا دیکھیں کیا دکھلائے آنکھوں کو
یہ برکھا برساتے دن تو بِن پریتم بیکار گئے

جب بھی لوٹے پیاسے لوٹے پھول نہ پاکر گلشن میں
بھنورے امرت رس کی دھن میں پَل پَل سو سو بار گئے

ہم سے پوچھو ساحل والو کیا بیتی دُکھیاروں پر
کھیون ہارے بیچ بھنور میں چھوڑ کے جب اُس پار گئے

○

پھُول سے ہونٹ چاند سا ماتھا
ہم نے بھی ایک خواب دیکھا تھا

کوئی بات ان لبوں تک آئی تھی
کوئی غنچہ ضرور چٹکا تھا

رات صحنِ خیال میں جالبؔ
اک عجب شخص رقص فرما تھا

○

نظر نظر میں لئے تیرا پیار پھرتے ہیں
مثالِ موجِ نسیمِ بہار پھرتے ہیں

ترے دیار سے ذرّوں نے روشنی پائی
ترے دیار میں ہم سوگوار پھرتے ہیں

یہ حادثہ بھی عجب ہے کہ تیرے دیوانے
لگائے دل سے غمِ روزگار پھرتے ہیں

لئے ہوئے ہیں دو عالم کا درد سینے میں
تری گلی میں جو دیوانہ وار پھرتے ہیں

بہار آکے چلی بھی گئی مگر جالبؔ
ابھی نگاہ میں وہ لالہ زار پھرتے ہیں

○

پھُول کو دیکھنے سے ایک نظر
کتنے عالم گزر گئے دِل پر

یوں بھی بے چینیاں نہیں جاتیں
ہم نے دیکھا خموش بھی رہ کر

شب کی تاریکیوں میں تیرا خیال
جیسے کھو جائے روشنی میں نظر

تیری بدلی ہوئی نظر توبہ
کتنا گہرا ہے زندگی پہ اثر

اس دیارِ ستم ظریفاں میں
فرصت ہاؤ ہو بہت ہے مگر

قہقہے بے شعور لوگوں کے
کس قدر بار ہیں سماعت پر

○

شوق آوارگی میں کیا نہ ہوا
ایک تیرا ہی سامنا نہ ہوا

حرفِ مطلب نہ آسکا لب پر
مطمئن ہیں کوئی خفا نہ ہوا

اس کے آنچل کو چھو رہی ہے صبا
وائے قسمت کہ میں صبا نہ ہوا

دل میں نوحہ کُناں رہا اک غم
گھر کبھی اپنا بے صدا نہ ہوا

ناخدا تو ہمیں ڈبو دیتا
خیر گزری کہ وہ خدا نہ ہوا

○

اُس گلی کے لوگوں کو منہ لگا کے پچھتائے
ایک درد کی خاطر کتنے درد اپنائے

تھک کے سوگیا سورج شام کے دھندلکوں میں
آج بھی کئی غنچے پھول بن کے مرجھائے

ہم ہنسے تو آنکھوں میں تیرنے لگی شبنم
تم ہنسے تو گلشنِ نے تم پہ پھول برسائے

اس گلی میں کیا کھویا اس گلی میں کیا پایا
تشنہ کام پہنچے تھے تشنہ کام لوٹ آئے

پھر رہی ہیں آنکھوں میں تیرے شہر کی گلیاں
ڈوبتا ہوا سورج پھیلتے ہوئے سائے

جالبؔ ایک آوارہ الجھنوں کا گہوارہ
کون اس کو سمجھائے کون اس کو سلجھائے

ہم پہ اس عہدِ کم نگاہی میں
کون سا جورِ ناروا نہ ہوا

اب تو ہم خاک ہو چکے جالبؔ
اب ہمارا کوئی ہوا نہ ہوا

O

حسرت رہی کوئی تو یہاں دیدہ ور ملے
لیکن تری گلی میں سبھی کم نظر ملے

ایسے بھی آشنا ہیں نہ دیکھا جنہیں کبھی
نا آشنا تھے وہ بھی جو شام و سحر ملے

شاید اسی لئے ہمیں منزل نہ مل سکی
جتنے بھی ہم کو لوگ ملے راہبر ملے

لکھی تھیں جن پہ اپنے جنوں کی حکایتیں
آوارگی میں ایسے بھی کچھ بام و در ملے

کیا کیا نظر نظر میں ہوئی گفتگو نہ پوچھ
مدت کے بعد جب وہ سرِ رہ گزر ملے

ہم کو تو داغِ دل کے سوا کچھ نہ مِل سکا
ان بستیوں میں پیار کسی کو مگر ملے

جالبؔ ہوائے لعل و گہر تھی نہ آج ہے
وہ سنگِ در عزیز ہے وہ سِنگ در ملے

○

اس کوئے ملامت پہ ہی موقوف نہیں ہے
ہر شہر میں آوارہ و بدنام رہے ہم

کس شوق سے بڑھتے رہے ہر شخص کی جانب
ہر شخص سے محروم بھر گام رہے ہم

اک عمر رہے منتظرِ عہدِ بہاراں
اک عمر اسیرِ خلشِ خام رہے ہم

ہم کہہ نہ سکے کھل کے کوئی بات کسی سے
ہر گام پہ لذت کشِ ابہام رہے ہم

کیوں اپنا مقدر نہ ہوئے عارض و گیسو
اس فکر میں سوزاں سحر و شام رہے ہم

اس پھول کو پانا تو بڑی بات ہے جالبؔ
اس پھول کو چھونے میں بھی ناکام رہے ہم

○

تیری آنکھوں کا عجب طُرفہ سماں دیکھا ہے
ایک عالم تری جانب نِگراں دیکھا ہے

کتنے انوار سمٹ آئے ہیں ان آنکھوں میں
اک تبسّم ترے ہونٹوں پہ رواں دیکھا ہے

ہم کو آوارہ و بے کار سمجھنے والو
تم نے کب اس بُتِ کافر کو جواں دیکھا ہے

صحنِ گلشن میں کہ انجم کی طرب گاہوں میں
تم کو دیکھا ہے کہیں، جانے کہاں دیکھا ہے؟

وہی آوارہ و دیوانہ و آشفتہ مزاج
ہم نے جالبؔ کو سرکوئے بتاں دیکھا ہے

○

جی دیکھا ہے مر دیکھا ہے
ہم نے سب کچھ کر دیکھا ہے

برگِ آوارہ کی صورت
رنگِ خشک و تر دیکھا ہے

ٹھنڈی آہیں بھرنے والو
ٹھنڈی آہیں بھر دیکھا ہے

تیری زلفوں کا افسانہ
رات کے ہونٹوں پر دیکھا ہے

اپنے دیوانوں کا عالم
تم نے کب آکر دیکھا ہے

انجمُ کی خاموش فضاء میں
میں نے تمھیں اکثر دیکھا ہے

ہم نے اس بستی میں جالبؔ
جھوٹ کا اونچا سر دیکھا ہے

○

تباہیوں پہ بھی دل کو ذرا ملال نہ تھا
خوشا وہ وہ دَور کہ جب زیست کا خیال نہ تھا

کہاں کہاں مری نظروں کو اک تلاش نہ تھی
کہاں کہاں مرے ہونٹوں پہ اک سوال نہ تھا

تری نگاہ سے کوئی گلہ نہیں اے دوست
تری نگاہ کے قابل ہمارا حال نہ تھا

کہاں گیا وہ زمانہ کہ جب ہمیں جالبؔ
خیالِ دہر نہ تھا فکرِ ماہ وسال نہ تھا

○

اُٹھتا ہوا چمن سے دھواں دیکھتے چلو
شاخوں پہ رقصِ برقِ تپاں دیکھتے چلو

لٹتی ہوئی متاعِ بیاں دیکھتے چلو
کٹتی ہوئی وفا کی زباں دیکھتے چلو

ہر سو فروغِ وہم و گماں دیکھتے چلو
مٹتا ہوا یقیں کا نشاں دیکھتے چلو

اپنے سے کچھ کہو نہ پرائے سے کچھ کہو
دل سوز و دل گداز سماں دیکھتے چلو

جلتا ہوا کسی کا نشیمن سرِ چمن
خاطر پہ ہو ہزار گراں دیکھتے چلو

توہینِ اہلِ حُسن کہ تضحیکِ اہلِ شوق
سب کچھ بجرمِ زیست یہاں دیکھتے رہو

ہر چند ناپسند ہو تحسینِ ناشناس
چپ چاپ شعریت کا زیاں دیکھتے چلو

اس شہر تیرگی میں نگاہِ خموش سے
شب دوستوں کو رقص کناں دیکھتے چلو

○

اب نہ وہ غزل اپنی اب نہ وہ بیاں اپنا
راکھ ہوگیا جل کر ہر حسیں گماں اپنا

وہ چمن جسے ہم نے خونِ دل سے سینچا تھا
اس پہ حق جتاتی ہیں آج بجلیاں اپنا

بجلیوں نے دنیا کو کچھ سکون تو بخشا
ہم بنائے لیتے ہیں اور آشیاں اپنا

کچھ دنوں رہی تو ہے داستانِ دل رنگین
کچھ دنوں رہا تو ہے کوئی ہم زباں اپنا

اس دیار کی راتیں نغمہ ریز برساتیں
ہر نظر شراب آلوُد ہر نفس جواں اپنا

منزلوں نہیں ملتا کوئی سایۂ دیوار
کس کے پاس جائیں ہم کون ہے یہاں اپنا

سرزمیں دو آبے کی ہم سے چھن گئی جالبؔ
آج تک اسی غم میں دل ہے نوحہ خواں اپنا

○

دل ہے اب پہلو میں یوں سہما ہُوا
جیسے کٹیا میں دیا جلتا ہُوا

اب نہ تیرا غم نہ تیری جستجو
زندگی میں کون یوں تنہا ہُوا

پھر رہا ہوں یوں تری گلیوں سے دور
جیسے کوئی راستہ بھولا ہُوا

○

جاگنے والو تابہ سحر خاموش رہو
کل کیا ہوگا کس کو خبر خاموش رہو

کس نے سحَر کے پاؤں میں زنجیریں ڈالیں
ہوجائے گی رات بسر خاموش رہو

شاید چُپ رہنے میں عزت رہ جائے
چپ ہی بھلی اے اہلِ نظر خاموش رہو

قدم قدم پر پہرے ہیں ان راہوں میں
دارورسن کا ہے یہ نگر خاموش رہو

یوں بھی کہاں بے تابئ دل کم ہوتی ہے
یوں بھی کہاں آرام، مگر خاموش رہو

شعر کی باتیں ختم ہوئیں اس عالم میں
کیسا جوشؔ اور کس کا جگرؔ خاموش رہو

○

غالبؔ و یگانہؔ سے لوگ بھی تھے جب تنہا
ہم سے طے نہ ہوگی کیا منزلِ ادب تنہا

فکرِ انجمن کس کو کیسی انجمن پیارے
اپنا اپنا غم سب کو سوچیئے تو سب تنہا

سن رکھو زمانے کی کل زباں پر ہوگی
ہم جو بات کرتے ہیں آج زیرِ لب تنہا

اپنی رہنمائی میں کی ہے زندگی ہم نے
ساتھ کون تھا پہلے ہوگئے جو اب تنہا

مہر ماہ کی صورت مسکرا کے گزرے ہیں
خاکدانِ تیرہ سے ہم بھی روز و شب تنہا

کتنے لوگ آبیٹھے پاس مہرباں ہو کر
ہم نے خود کو پایا ہے تھوڑی دیر جب تنہا

یاد بھی ہے ساتھ اُن کی اور غمِ زمانہ بھی
زندگی میں اے جالبؔ ہم ہوئے ہیں کب تنہا

○

اپنوں نے وہ رنج دیئے ہیں' بیگانے یاد آتے ہیں
دیکھ کے اس بستی کی حالت ویرانے یاد آتے ہیں

اس نگری میں قدم قدم پہ سر کو جُھکانا پڑتا ہے
اس نگری میں قدم قدم پر بُت خانے یاد آتے ہیں

آنکھیں پُرنم ہوجاتی ہیں غربت کے صحراؤں میں
جب اُس رم جھم کی وادی کے افسانے یاد آتے ہیں

ایسے ایسے درد ملے ہیں نئے دیاروں میں ہم کو
بچھڑے ہوئے کچھ لوگ پرانے یارانے یاد آتے ہیں

جن کے کارن آج ہمارے حال پہ دنیا ہنستی ہے
کتنے ظالم چہرے جانے پہچانے یاد آتے ہیں

یوں نہ لُٹی تھی گلیوں گلیوں دولت اپنے اشکوں کی
روتے ہیں تو ہم کو اپنے غم خانے یاد آتے ہیں

کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے گریباں کا جالبؔ
چاروں جانب سناٹا ہے دیوانے یاد آتے ہیں

○

نہ ڈگمگائے کبھی ہم وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

کسے لگائے گلے اور کہاں کہاں ٹھہرے
ہزار غنچہ و گُل ہیں صبا کے رستے میں

خدا کا نام کوئی لے تو چونک اٹھتے ہیں
ملے ہیں ہم کو وہ رہبر خدا کے رستے میں

کہیں سلاسِلِ تسبیح اور کہیں زُنّار
بچھے ہیں دام بہت مدّعا کے رستے میں

ابھی وہ منزلِ فکر و نظر نہیں آئی
ہے آدمی ابھی جرم و سزا کے رستے میں

ہیں آج بھی وہی دارورسن وہی زندان
ہر اک نگاہِ رُموزِ آشنا کے رستے میں

یہ نفرتوں کی فصیلیں، جہالتوں کے حصار
نہ رہ سکیں گے ہماری صدا کے رستے میں

مٹا سکے نہ کوئی سیلِ انقلاب جنہیں
وہ نقش چھوڑے ہیں ہم نے وفا کے رستے میں

زمانہ ایک سا جالبؔ سدا نہیں رہتا
چلیں گے ہم بھی کبھی سر اُٹھا کے رستے میں

○

ویراں ہے میری شام' پریشاں مری نظر
اچھا ہوا کہ تم نہ ہوئے میرے ہم سفر

کوئی صدا نہیں کہ جسے زندگی کہوں
مدّت سے ہے خموش مرے دل کی رہ گزر

لو اب تو شورِ نالہ و فریاد تھم گیا
میرے جنوں پہ ایک زمانے کی تھی نظر

اے میرے ماہتاب کہاں چھُپ گیا ہے تو
تجھ بن بجھے بجھے ہیں محبت کے بام و در

تیرے بغیر کتنی فسردہ ہے بزمِ شعر
اے دوست اب پڑھوں میں غزل کس کو دیکھ کر

میں تیری بے رخی کو بھی سمجھوں گا التفات
پیارے مرے قریب سے اک بار پھر گزر

جالبؔ مجھے تو اُن کے گریبان کی فکر ہے
جو ہنس رہے ہیں میرے گریباں کے چاک پر

○

جس کی آنکھیں غزل ہر ادا شعر ہے
وہ مری شاعری ہے مرا شعر ہے

وہ حسیں زلف شب کا فسانہ لئے
وہ بدن نغمگی وہ قبا شعر ہے

وہ تکلّم لہکتی ہوئی چاندنی
وہ تبسم مہکتا ہوا شعر ہے

پھول بھی ہیں بہاریں بھی ہیں گیت بھی
ہم نشیں اس گلی کی فضا شعر ہے

جس سے روشن تھا دل وہ کرن چھن گئی
اپنے جینے کا اب آسرا شعر ہے

اپنے انداز میں بات اپنی کہو
میرؔ کا شعر تو میرؔ کا شعر ہے

میں جہانِ ادب میں اکیلا نہیں
ہر قدم پر مراہم نوا شعر ہے

عرش پر خود کو محسوس ہم نے کیا
جب کسی نے کہا واہ کیا شعر ہے

اک قیامت ہے جالبؔ یہ تنقیدِ نوَ
جو سمجھ میں نہ آئے بڑا شعر ہے

○

جیون مجھ سے میں جیون سے شرماتا ہوں
مجھ سے آگے جانے والو میں آتا ہوں

جن کی یادوں سے روشن ہیں میری آنکھیں
دل کہتا ہے ان کو بھی میں یاد آتا ہوں

سُر سے سانسوں کا ناتا ہے توڑوں کیسے
تم جلتے ہو کیوں جِیتا ہوں کیوں گاتا ہوں

تم اپنے دامن میں ستارے بیٹھ کے ٹانکو
اور میں نئے برن لفظوں کو پہناتا ہوں

جن خوابوں کو دیکھ کے میں نے جینا سیکھا
اُن کے آگے ہر دولت کو ٹھکراتا ہوں

زہر اگلتے ہیں جب مِل کر دنیا والے
میٹھے بولوں کی وادی میں کھو جاتا ہوں

جالبؔ میرے شعر سمجھ میں آجاتے ہیں
اسی لئے کم رُتبہ شاعر کہلاتا ہوں

○

ہم کو نظروں سے گرانے والے
ڈھونڈ اب ناز اُٹھانے والے

چھوڑ جائیں گے کچھ ایسی یادیں
روئیں گے ہم کو زمانے والے

رہ گئے نقش ہمارے باقی
مٹ گئے ہم کو مٹانے والے

منزلِ گُل کا پتا دیتے ہیں
راہ میں خار بچھانے والے

ان زمینوں پہ گُہر برسیں گے
ایسے کچھ ابر ہیں چھانے والے

دیکھ وہ صبح کا سورج نکلا
مسکرا اشک بہانے والے

آس میں بیٹھے ہیں جن کی جالبؔ
وہ زمانے بھی ہیں آنے والے

○

ناشناسوں کی محفل میں اے نغمہ گر!
فن کو رسوا نہ کر، فن کو رسوا نہ کر

کون اس انجمن میں ہے اہلِ نظر
دولتِ رائیگاں ہے متاعِ ہنر

کتنے بے نور ہیں آفتاب و قمر
گردش روز و شب آگئے ہم کدھر

کتنی ویران ہیں پیار کی بستیاں
نوحہ گر ہے وفا رہگزر رہگزر

جہل مسند نشیں ہے بصد تمکنت
ہم نشیں کیوں نہ ہو علم کی آنکھ تر

شیخ کی آنکھ میں بھی مروّت نہیں
برہمن بھی محبت سے ہے بے خبر

میں بھی منصور ہوں، میں بھی منصور ہوں
کاٹ دو میرا سر، کاٹ دو میرا سر

دل میں روشن ہے اب تک تری آرزو
اے دیارِ سحر، اے دیارِ سحر

○

یہ زندگی، گزار رہے ہیں جو ہم یہاں
یہ زندگی نصیب ہے لوگوں کو کم یہاں

کوشش کے باوجود بھلائے نہ جائیں گے
ہم پر جو دوستوں نے کئے ہیں کرم یہاں

کہنے کو ہم سفر ہیں بہت اس دیار میں
چلتا نہیں ہے ساتھ کوئی دو قدم یہاں

دیوارِ یار ہو کہ شبستانِ شہرِ یار
دو پل کو بھی کسی کے نہ سائے میں تھم یہاں

ان بستیوں میں رسمِ وفا ختم ہوچکی
اے چشمِ نم کسی سے نہ کر عرضِ غم یہاں

صد حیف جن کے دم سے پریشاں ہے آدمی
سب کی نگاہ میں ہے وہی محترم یہاں

نظمیں اُداس اُداس فسانے بجھے بجھے
مدّت سے اشکبار ہیں لوح و قلم یہاں

اے ہم نفس یہی تو ہمارا قصور ہے
کرتے ہیں دھڑکنوں کے فسانے رقم یہاں

○

آج ہمارے حال پہ ہنس لو شہر کے عزت دارو
کل کو تمہارے حال پہ ہم کو اشک بہانے ہوں گے

ابھی کہاں تکمیل ہوئی ہے اپنے جنوں کی پیارے
اور ابھی لڑکوں کے ہاتھوں پتھر کھانے ہوں گے

اور ابھی توہینِ محبت قدم قدم پر ہوگی
اور ابھی بے درد جہاں کے ناز اٹھانے ہوں گے

تم تو کسی کو بھُولے سے بھی یاد نہیں آؤ گے
آنے والے عہد کے لب پر اپنے فسانے ہوں گے

تم نے بھی تو محفل میں سب راز کی باتیں کہہ دیں
شہروں میں جالبؔ تم سے بھی کم ہی دیوانے ہوں گے

○

ترے ماتھے پہ جب تک بل رہا ہے
اجالا آنکھ سے اوجھل رہا ہے

سماتے کیا نظر میں چاند تارے
تصور میں ترا آنچل رہا ہے

تری شانِ تغافل کو خبر کیا
کوئی تیرے لئے بے کل رہا ہے

شکایت ہے غمِ دوراں کو مجھ سے
کہ دل میں کیوں ترا غم پل رہا ہے

تعجب ہے ستم کی آندھیوں میں
چراغِ دل ابھی تک جل رہا ہے

لہو روئیں گی مغرب کی فضائیں
بڑی تیزی سے سورج ڈھل رہا ہے

زمانہ تھک گیا' جالبؔ ہی تنہا
وفا کے راستے پر چل رہا ہے

○

کہیں آہ بن کے لب پر ترا نام آ نہ جائے
تجھے بے وفا کہوں میں وہ مقام آ نہ جائے

ذرا زلف کو سنبھالو مرا دل دھڑک رہا ہے
کوئی اور طائرِ دل تہہِ دام آ نہ جائے

جِسے سُن کے ٹوٹ جائے مرا آرزو بھرا دل
تری انجمن سے مجھ کو وہ پیام آ نہ جائے

وہ جو منزلوں پہ لاکر کسی ہم سفر کو لُوٹیں
انہیں رہزنوں میں تیرا کہیں نام آ نہ جائے

اسی فکر میں ہیں غلطاں یہ نظامِ زر کے بندے
جو تمام زندگی ہے وہ نظام آ نہ جائے

یہ مہ و نجوم ہنس لیں مرے آنسوؤں پہ جالبؔ
مرا ماہتاب جب تک لبِ بام آ نہ جائے

○

کیسی ہوا گلشن میں چلی
مُرجھائی ایک ایک کلی

دل کی کہانی کیا کہیے
اپنی آگ ہی شمع جلی

اُس لَٹ کا الجھاؤ کیا
ایک بَلا تو سر سے ٹلی

دنیا نے وہ درد دیئے
بھول گئے ہم ان کی گلی

بول کے جالبؔ قدر نہ کھو
اس ماحول میں چُپ ہی بھلی

○

نہ وہ ادائے تکلّم نہ احتیاطِ زباں
مگر یہ ضِد کہ ہمیں اہلِ لکھنؤ کہیے

نہ دل میں رقصِ غزل ہے نہ دھڑکنوں کے گیت
اُجڑ گیا ہے جسے شہرِ آرزو کہیے

کہاں اب اُن کو پکاریں، کہاں گئے وہ لوگ
جنہیں فسونِ طرب موجِ رنگ و بو کہیے

غزل کی بات جو کرتا ہے کم نظر نقّاد
اسے بھی شیخ کا اندازِ گفتگو کہیے

ادب کا آپ ہی تنہا نہ ساتھ دیں جالبؔ
کہے جو آپ کو 'تم' آپ اس کو 'تو' کہیے

○

بُھلا بھی دے اُسے جو بات ہوگئی پیارے
نئے چراغ جلا رات ہوگئی پیارے

تری نگاہِ پشیماں کو کیسے دیکھوں گا
کبھی جو تجھ سے ملاقات ہوگئی پیارے

نہ تیری یاد، نہ دنیا کا غم نہ اپنا خیال
عجیب صورتِ حالات ہوگئی پیارے

اداس اُداس ہیں شمعیں بجُھے بجھے ساغر
یہ کیسی شامِ خرابات ہوگئی پیارے

کبھی کبھی تیری یادوں کی سانولی رُت میں
بہے جو اشک تو برسات ہوگئی پیارے

وفا کا نام نہ لے گا کوئی زمانے میں
ہم اہلِ دل کو اگر مات ہوگئی پیارے

تمہیں تو ناز بہت دوستوں پہ تھا جالبؔ
الگ تھلگ سے ہو، کیا بات ہوگئی پیارے

○

درخت سوکھ گئے رک گئے ندی نالے
یہ کس نگر کو روانہ ہوئے گھروں والے

کہانیاں جو سناتے تھے عہدِ رفتہ کی
نشاں وہ گردشِ ایّام نے مٹا ڈالے

میں شہر شہر پھرا ہوں اسی تمنا میں
کسی کو اپنا کہوں، کوئی مجھ کو اپنا لے

صدا نہ دے کسی مہتاب کو اندھیروں میں
لگا نہ دے یہ زمانہ زبان پر تالے

کوئی کرن ہے یہاں تو کوئی کرن ہے وہاں
دل و نگاہ نے کس درجہ روگ ہیں پالے

ہمیں پہ ان کی نظر ہے ہمیں پہ ان کا کرم
یہ اور بات یہاں اور بھی ہیں دل والے

کچھ اور تجھ پہ کُھلیں گی حقیقتیں جالبؔ
جو ہو سکے تو کسی کا فریب بھی کھا لے

○

بڑھائیں گے نہ کبھی ربط ہم بہاروں سے
ٹپک رہا ہے لہو اب بھی شاخساروں سے

کہیں تو اپنی محبت پہ حرف آتا ہے
کچھ ایسے داغ بھی ہم کو ملے ہیں یاروں سے

نگاہِ دہر میں ذرّے سہی مگر ہم لوگ
ضیا کی بھیک نہیں مانگتے ستاروں سے

وہ داستاں ہیں کہ دُہرائے گی جسے دنیا
وہ بات ہیں جو سنی جائے گی نگاروں سے

ہمارے نام سے ہے آشنا چمن سارا
سخن کی داد ملی ہے ہمیں ہزاروں سے

فضا نہیں ہے ابھی کھُل کے بات کرنے کی
بدل رہے ہیں زمانے کو ہم اشاروں سے

نہ چھوڑنا کبھی طوفاں میں آس کی پتوار
یہ آرہی ہے صدا دم بہ دم کناروں سے

جہاں میں آج بھی محفوظ ہیں وہی نغمے
محبتوں میں جو ابھرے ہیں دل کے تاروں سے

بزرگ بیٹھ کے لکھتے تھے عرش پر جالبؔ
اٹھائی بات مگر ہم نے رہگزاروں سے

○

غزلیں تو کہی ہیں کچھ ہم نے ان سے نہ کہا احوال تو کیا
کل مثلِ ستارہ ابھریں گے' ہیں آج اگر پامال تو کیا

جینے کی دعا دینے والے یہ راز تجھے معلوم نہیں
تخلیق کا اک لمحہ ہے بہت' بیکار جیے سو سال تو کیا

سکوّں کے عوض جو بک جائے وہ میری نظر میں حسُن نہیں
اے شمعِ شبستانِ دولت! تو ہے جو پری تمثال تو کیا

ہر پھول کے لب پر نام مرا چرچا ہے چمن میں عام مرا
شہرت کی یہ دولت کیا کم ہے گر پاس نہیں ہے مال تو کیا

ہم نے جو کیا محسوس کہا جو درد ملا ہنس ہنس کے سہا
بھولے گا نہ مستقبل ہم کو نالاں ہے جو ہم سے حال تو کیا

ہم اہلِ محبت پالیں گے اپنے ہی سہارے منزل کو
یارانِ سیاست نے ہر سُو پھیلائے ہیں رنگیں جال تو کیا

دنیائے ادب میں اے جالبؔ اپنی بھی کوئی پہچان تو ہو
اقبالؔ کا رنگ اڑانے سے تو بن بھی گیا اقبالؔ تو کیا

○

نہ کلیوں میں رنگت نہ پھولوں میں باس
بہار آئی پہنے خزاں کا لباس

گھنی چھاؤں میں دو گھڑی بیٹھ لو
کڑی دھوپ میں جاؤ گے کس کے پاس

ستارو یونہی جگمگاتے رہو
رفیقو، کہیں ٹوٹ جائے نہ آس

○

شہر سے بستی سے ویرانے سے دل گھبرا گیا
اے جنوں تیرے ہر افسانے سے دل گھبرا گیا

اِک مکمل خامُشی اِک بیکراں گہرا سکوت
آج صحرا کا بھی دیوانے سے دل گھبرا گیا

پھر گئے جالبؔ نگاہوں میں کئی اُجڑے چمن
موسمِ گل کا خیال آنے سے جی گھبرا گیا

○

اُٹھ گیا ہے دلوں سے پیار یہاں
کتنے بے نُور ہیں دیار یہاں

روشنی روشنی، حیات حیات
ہر طرف ہے یہی پُکار یہاں

راستہ کیا سجھائی دے اے دوست
جہل ہے شمعِ رہگذار یہاں

○

اجنبی دیاروں میں پھر رہے ہیں آوارہ
اے غمِ جہاں تونے یہ بھی دن دکھائے ہیں

تیرے بام و در سے دُور تیرے رہگزر سے دور
رات کی سیاہی ہے تیرگی کے سائے ہیں

اس نگاہ سے جالبؔ رسم و راہ کی خاطر
ہم نے کم نگاہوں کے ناز بھی اٹھائے ہیں

حُسن کا ہم نے کیا چرچا بہت
حُسن کے ہاتھوں ہوئے رسوا بہت

موج نکہت اپنی قسمت میں نہ تھی
دور سے اس پھول کو دیکھا بہت

وہ ملا تھا راہ میں اک شام کو
پھر اسے میں نے یہاں ڈھونڈا بہت

○

میں بھی ہُوں تری طرح سے آوارہ و بیکار
اُڑتے ہوئے پتّے مجھے ہمراہ لئے چل

○

مرا قصور کہ میں ان کے ساتھ چل نہ سکا
وہ تیز گام مرا انتظار کیوں کرتے

○

کسے خبر تھی ہمیں راہبر ہی لُوٹیں گے
بڑے خلوص سے ہم کارواں کے ساتھ رہے

○

○

ہم اُن نجوم کی تابش بھی چھین سکتے ہیں
بنا دیا ہے جنہیں فخرِ آسماں ہم نے

○

ابھی اے دوست ذوقِ شاعری ہے وجہِ رسوائی
تری بستی میں ہم پر اور بھی الزام آئیں گے

اگر اب بھی ہمارا ساتھ تُو اے دل نہیں دے گا
تو ہم اس شہر میں تجھ کو اکیلا چھوڑ جائیں گے

○

خامشی سے ہزار غم سہنا
کتنا دشوار ہے غزل کہنا

شہر دھلی

دیارِ داغؔ و بیخودؔ شہر دہلی چھوڑ کر تجھ کو
نہ تھا معلوم یوں روئے گا دل شام و سحر تجھ کو

کہاں ملتے ہیں دنیا کو کہاں ملتے ہیں دنیا میں
ہوئے تھے جو عطاء اہلِ سخن اہلِ نظر تجھ کو

تجھے مرکز کہا جاتا تھا دنیا کی نگاہوں کا
محبت کی نظر سے دیکھتے تھے سب نگر تجھ کو

بقولِ میرؔ اوراقِ مصور تھے ترے کوچے
مگر ہائے زمانے کی لگی کیسی نظر تجھ کو

نہ بھولے گا ہماری داستاں تو بھی قیامت تک
دلائیں گے ہماری یاد تیرے رہگزر تجھ کو

جو تیرے غم میں بہتا ہے وہ آنسو رشک گوہر ہے
سمجھتے ہیں متاعِ دیدہ و دل دیدہ ور تجھ کو

میں جالبؔ دہلوی کہلا نہیں سکتا زمانے میں
مگر سمجھا ہے میں نے آج تک اپنا ہی گھر تجھ کو

لائل پور

لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد
دھڑکن دھڑکن ساتھ رہے گی اس بستی کی یاد

میٹھے بولوں کی وہ نگری گیتوں کا سنسار
ہنستے بستے ہائے وہ رستے نغمہ ریز دیار
وہ گلیاں' وہ پھول' وہ کلیاں رنگ بھرے بازار
میں نے ان گلیوں' پھولوں' کلیوں سے کیا ہے پیار

برگِ آوارہ میں بکھری ہے جس کی روداد
لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد

کوئی نہیں تھا کام مجھے پھر بھی تھا کتنا کام
ان گلیوں میں پھرتے رہنا دن کو کرنا شام
گھر گھر میرے شعر کے چرچے گھر گھر میں بدنام
راتوں کو دہلیزوں پر ہی کرلینا آرام

دُکھ سہنے میں چپ رہنے میں دل تھا کتنا شاد
لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد

میں نے اس نگری میں رہ کر کیا کیا لکھّے گیت
جن کے کارن لوگوں کے من میں ہے میری پریت
ایک لگن کی بات ہے جیون کیسی ہار اور جیت
سب سے مجھ کو پیار ہے جالبؔ سب ہیں میرے میت

داد تو ان کی یاد ہے مجھ کو بھول گیا بے داد
لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد

متاعِ غیر

آخر کار یہ ساعت بھی قریب آپہنچی
تو مری جان کسی اور کی ہوجائے گی
کل تلک میرا مقدر تھی تری زلف کی شام
کیا تغیر ہے کہ تو غیر کی کہلائے گی
میرے غم خانے میں تو اب نہ کبھی آئے گی

تیری سہمی ہوئی معصوم نگاہوں کی زباں
میری محبوب کوئی اجنبی کیا سمجھے گا
کچھ جو سمجھا بھی تو اس عینِ خوشی کے ہنگام
تیری خاموش نگاہی کو حیا سمجھے گا
تیرے بہتے ہوئے اشکوں کو ادا سمجھے گا

میری دم ساز زمانے سے چلی آتی ہیں
رہنِ غم وقفِ الم سادہ دلوں کی آنکھیں
یہ نیا ظلم نہیں پیار کے متوالوں پر
ہم نے دیکھیں یونہی نم سادہ دلوں کی آنکھیں
اور رولیں کوئی دم سادہ دلوں کی آنکھیں

رُخصتی

تو کلی نزہتوں نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گُل سوے صحرا چلی

وہ سلگتا دیا تو سحر کی کرن
سوچتا ہوں یہی کیسے بہلے گا من
دھڑکنوں کو سکوں کیسے بخشے گا دھن
لوگ تجھ کو کہیں گے نصیبوں جلی
تو کلی نزہتوں نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل سوئے صحرا چلی

تو جہاں سے گزرتی تھی شام و سحر
اب کہاں کہکشاں وہ حسیں رہ گزر
شامِ غم چھائی ہے دیکھتا ہوں جدھر
کتنی ویران ہے آج تیری گلی
تو کلی نزہتوں نکتھوں میں پلی
چھوڑ کر شہر گل سوئے صحرا چلی

رخصتی کا گیت

جب تو جائے گی گھر اپنے
یاد آئیں گے سندر سپنے
دھڑکن لگ جائے گی جپنے
بیتی برساتوں کی مالا
جادوگر راتوں کی مالا

بیٹھے بیٹھے کھو جائے گی
خاموشی کے صحراؤں میں
اک ہلچل سی مچ جائے گی
سہمی سہمی آشاؤں میں

ناتھ آئیں گے پیار جتانے
روٹھی ہوئی رادھا کو منانے
دل کا درد کوئی کیا جانے

سونے کی دنیا میں رہ کر
پیلی پیلی ہوجائے گی
بھیگی بھیگی سی آنکھوں میں
پل چھن سرسوں لہرائے گی

پیڑوں کی وہ ٹھنڈی چھاؤں
سندر سکھیاں پنگھٹ گاؤں
چھن چھن پائل ننگے پاؤں

حسبِ فرمائش

میں تجھے پھول کہوں اور کہوں بھونروں سے
"آؤ اس پھول کا رس چوس کے ناچو جھومو"
میں تجھے شمع کہوں اور کہوں "پروانو!"
آؤ اس شمع کے ہونٹوں کو خوشی سے چومو"

میں تری آنکھ کو تشبیہ دوں میخانے سے
اور خود زہر جدائی کا طلب گار رہوں
غیر سوئے تری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں
اور میں چاندنی راتوں میں فقط شعر کہوں

مجھ سے یہ تیرے قصیدے نہ لکھے جائیں گے
مجھ سے تیرے لئے غزلیں نہ کہی جائیں گی
یاد میں تیری میں سُلگا نہ سکوں گا آنکھیں
سختیاں درد کی مجھ سے نہ سہی جائیں گی

شہر میں ایسے مصوّر ہیں جو سِکوّں کے عوض
حسن میں لیلیٰ و عذرا سے بڑھا دیں گے تجھے
طول دے کر تری زلفوں کو شب غم کی طرح

فن کے اعجاز سے ناگن سی بنا دیں گے تجھے

تجھ کو شہرت کی ضرورت ہے محبت کی مجھے
اے حسینہ تری منزل مری منزل میں نہیں
ناچ گھر تیری نگاہوں میں ہیں رقصاں لیکن
اس تعیش کی تمنائیں مرے دل میں نہیں

دیکھ کے غیر کے پہلو میں تجھے رقص کناں
بھیگ جاتی ہے مری آنکھ سرشکِ غم سے
مجھ کو برسوں کی غلامی کا خیال آتا ہے
جس نے اندازِ وفا چھین لیا ہے ہم سے

مجھ کو بھونرا نہ سمجھ، مجھ کو پتنگا نہ سمجھ
مجھ کو انسان سمجھ میری صداقت سے نہ کھیل
تیری تفریح کا سامان نہ بنوں گا ہرگز
میری دنیا ہے یہی میری محبت سے نہ کھیل

کافی ہاؤس

دن بھر کافی ہاؤس میں بیٹھے کچھ دُبلے پتلے نقاد
بحث یہی کرتے رہتے ہیں ست ادب کی ہے رفتار
صرف ادب کے غم میں غلطاں چلنے پھرنے سے لاچار
چہروں سے ظاہر ہوتا ہے جیسے برسوں کے بیمار

اردو ادب میں ڈھائی ہیں شاعر میرؔ و غالبؔ آدھا جوشؔ
یا اک آدھ کسی کا مصرعہ یا اقبالؔ کے چند اشعار
یا پھر نظم ہے اک چوہے پر حامد مدنیؔ کا شہکار
کوئی نہیں ہے اچھا شاعر کوئی نہیں افسانہ نگار

منٹو کرشنؔ ندیمؔ اور بیدیؔ ان میں جان تو ہے لیکن
عیب یہ ہے ان کے ہاتھوں میں کند زباں کی ہے تلوار
عالیؔ افسرؔ، انشاؔ بابو، ناصرؔ میرؔ کے برخوردار
فیضؔ نے جواب تک لکھا ہے، کیا لکھا ہے سب بیکار

ان کو ادب کی صحت کا غم مجھ کو ان کی صحت کا
یہ بے چارے دکھ کے مارے جینے سے ہیں کیوں بیزار
حسن سے وحشت عشق سے نفرت اپنی ہی صورت سے پیار
خندۂ گل پر ایک تبسم گریہ شبنم سے انکار

نئی پود

ریستوراں میں بیٹھو اور کانٹے سے کھانا کھاؤ
الجھے الجھے شعر کہو ذہنوں کو خوب الجھاؤ
میر کے مصرعے آگے رکھ کر غزلیں کہتے جاؤ
خود کو پورا میرؔ کو آدھا ہی شاعر بتلاؤ
اور پھر نئی پود کہلاؤ

ٹیبل پر جو بات کرو بس لکھتے جاؤ یارو
اور پھر اس کو ماہِ نو کے ماتھے پر دے مارو
سب تم کو فن کار کہیں تم روپ کچھ ایسا دھارو
مکتب کے لڑکوں کو اپنی نظمیں یاد کراؤ
اور پھر نئی پود کہلاؤ

ارباب ذوق

گھر سے نکلے کار میں بیٹھے، کار سے نکلے دفتر پہنچے
دن بھر دفتر کو ٹرخایا
شام کو جب اندھیارا چھایا
محفل میں ساغر چھلکایا
پھول پھول بھونرا لہرایا رات کے ایک بجے گھر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

غالب سے ہے ان کو رغبت
میر سے بھی کرتے ہیں اُلفت
اور تخلص بھی ہے عظمت
گھر اقبال کے کھانے دعوت چھوٹی عمر میں اکثر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

حلقے میں اتوار منایا
ان کا ہے انداز پرانا
نئی ادائیں نیا زمانہ
منٹو کا سننے افسانا اکثر پہنے نیکر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

ناک پہ چشمہ سا اٹکائے
گردن میں ٹائی لٹکائے
انگلش لٹریچر کو کھائے
اردو لٹریچر پر ہائے کالج دینے لیکچر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے، کار سے نکلے دفتر پہنچے

روئے بھگت کبیر

پوچھ نہ کیا لاہور میں دیکھا ہم نے میاں نظیر
پہنیں سوٹ انگریزی بولیں اور کہلائیں میر
چودھریوں کی مٹّھی میں ہے شاعر کی تقدیر
روئے بھگت کبیر

اک دوجے کو جاہل سمجھیں نٹ کھٹ بدّھی وان
میٹرو میں جو چائے پلائے بس وہ باپ سمان
سب سے اچھا شاعر وہ ہے جس کا یار مدیر
روئے بھگت کبیر

سڑکوں پر بھوکے پھرتے ہیں شاعر موسیقار
ایکٹرسوں کے باپ لئے پھرتے ہیں موٹر کار
فلم نگر تک آپہنچے ہیں سیّد پیر فقیر
روئے بھگت کبیر

لال دین کی کوٹھی دیکھی رنگ بھی جس کا لال
شہر میں رہ کر خوب اڑائے دہقانوں کا مال
اور کہے اجداد نے بخشی مجھ کو یہ جاگیر
روئے بھگت کبیر

جس کو دیکھو لیڈر ہے اور جس سے ملو وکیل
کسی طرح بھرتا ہی نہیں ہے پیٹ ہے' ان کا جھیل
مجبوراً سننا پڑتی ہے ان سب کی تقریر

روئے بھگت کبیر
محفل سے جو اٹھ کر جائے کہلائے وہ بور
اپنی مسجد کی تعریفیں باقی جوتے چور
اپنا جھنگ بھلا ہے پیارے جہاں ہماری ہیر
روئے بھگت کبیر

بھئے کبیر اُداس

اک پٹڑی پر سردی میں اپنی تقدیر کو روئے
دوجا زلفوں کی چھاؤں میں سکھ کی سیج پہ سوئے
راج سنگھاسن پر اک بیٹھا اور اک اس کا داس
بھئے کبیر اداس

اونچے اونچے ایوانوں میں مورکھ حکم چلائیں
قدم قدم پر اس نگری میں پنڈت دھکّے کھائیں
دھرتی پر بھگوان بنے ہیں دھن ہے جن کے پاس
بھئے کبیر اداس

گیت لکھائیں پیسے نا دیں فلم نگر کے لوگ
ان کے گھر باجے شہنائی لیکھک کے گھر سوگ
گائک سُر میں کیونکر گائے کیوں نا کاٹے گھاس
بھئے کبیر اداس

کل تک تھا جو حال ہمارا حال وہی ہے آج
جالبؔ اپنے دیس میں سُکھ کا کال وہی ہے آج
پھر بھی موچی گیٹ پہ لیڈر روز کریں بکواس
بھئے کبیر اُداس

یہ وزیرانِ کرام

کوئی ممنون فرنگی، کوئی ڈالر کا غُلام
دھڑکنیں محکوم ان کی لب پہ آزادی کا نام
ان کو کیا معلوم کس حالت میں رہتے ہیں عوام
یہ وزیران کرام
ان کو فرصت ہے بہت اونچے امیروں کے لئے
ان کے ٹیلیفون قائم ہیں سفیروں کے لئے
وقت ان کے پاس کب ہے ہم فقیروں کے لئے
چھو نہیں سکتے انہیں ہم، ان کا اونچا ہے مقام
یہ وزیران کرام
صبح چائے ہے یہاں تو شام کھانا ہے وہاں
کیوں نہ ہوں مغرور چلتی ہے میاں ان کی دکاں
جب یہ چاہیں ریڈیو پر جھاڑ سکتے ہیں بیاں
ہم ہیں پیدل، کار پر یہ کس طرح ہوں ہم کلام
یہ وزیران کرام

قوم کی خاطر اسمبلی میں یہ مرجاتے بھی ہیں
قوت بازو سے اپنی بات منواتے بھی ہیں
گالیاں دیتے بھی ہیں اور گالیاں کھاتے بھی ہیں
یہ وطن کی آبرو ہیں، کیجئے ان کو سلام

یہ وزیران کرام

ان کی محبوبہ وزارت داشتائیں کرسیاں
جان جاتی ہے تو جائے پر نہ جائیں کرسیاں
دیکھیے یہ کب تلک یوں ہی چلائیں کرسیاں
عارضی ان کی حکومت عارضی ان کا قیام

یہ وزیران کرام

مشاعِرہ

ابھی جو پاس سے گزری ہے خاک اڑاتی ہوئی
یہی وہ کار تھی جس میں وہ لوگ آئے تھے
حضور آپ ہی جالبؔ ہیں، آپ کی خاطر
تمام شہر میں دیوانہ وار گھومے ہیں
کسی طرح سے کہیں آپ کا سُراغ ملے
حضور ہم نے بگولوں کے پاؤں چومے ہیں
ابھی جو پاس سے گزری ہے خاک اڑاتی ہوئی
مشاعرے میں اسی کار سے گیا تھا میں

ہم دیکھتے ہیں

21 جون 1958ء کو لاہور میں نابیناؤں کی امدادی انجمن کے مشاعرے میں پڑھی گئی

وہی عالم ہے جو تم دیکھتے ہو
نہیں کچھ مختلف عالم ہمارا
جلائے ہم نے پلکوں پر دیئے بھی
نہ چمکا پھر بھی قسمت کا ستارا
وہی ہے وقت کا بے نور دھارا

وہی سر پر مسلّط ہے شبِ غم
اندھیرے ہر طرف چھائے ہوئے ہیں
نہیں ملتی خوشی کی اک کرن بھی
مہ و خورشید گہنائے ہوئے ہیں
یہ کس بستی میں ہم آئے ہوئے ہیں

شکایت ہے تمہیں آنکھوں سے اپنی
یہاں آنکھیں کہاں روشن رفیقو
کلی کی آنکھ نم، روتی ہے شبنم
سلگتے ہیں گلوں کے تن رفیقو
نظر آتے ہیں گلشن بَن رفیقو

جنہیں ہم شعر میں کہتے ہیں جادو
اُن آنکھوں کو یہاں نم دیکھتے ہیں
لبوں پر آہ اور زلفیں پریشاں
غزل کو وقف ماتم دیکھتے ہیں
ستم کیا کم ہے یہ ہم دیکھتے ہیں

احمد ریاض کی یاد میں

پہلے ہی اپنا کون تھا اے دوست
اب جو تو ہوگیا جُدا اے دوست

ساتھ کس نے دیا کسی کا یہاں
ساری دنیا ہے بے وفا اے دوست

تو جلا شمع کی طرح سرِ بزم
نور تھا تیرا ہم نوا اے دوست

کتنی خوش بخت ہے زمیں وہ بھی
اب جو دے گی ترا پتا اے دوست

یہ زمانہ ہے شعر کا دشمن
اس زمانے کا کیا گِلا اے دوست

صبح آئے گی لے کے وہ خورشید
جس پہ تو ہوگیا فدا اے دوست

شہرِ ظلمات کو ثبات نہیں

اے نظامِ کہن کے فرزندو
اے شب تار کے جگر بندو

یہ شبِ تار جاوداں تو نہیں
یہ شبِ تار جانے والی ہے
تابکے تیرگی کے افسانے
صبحِ نو مسکرانے والی ہے

اے شبِ تار کے جگر گوشو
اے سحر دشمنو ستم کوشو

صبح کا آفتاب چمکے گا
ٹوٹ جائے گا جہل کا جادو
پھیل جائے گی ان دیاروں میں
علم و دانش کی روشنی ہر سُو

اے شبِ تار کے نگہبانو
شمعِ عہدِ زیاں کے پروانو
شہرِ ظلمات کے ثنا خوانو

شہرِ ظلمات کو ثبات نہیں
اور کچھ دیر صبح پر ہنس لو
اور کچھ دیر۔۔ کوئی بات نہیں

مستقبل

تیرے لئے میں کیا کیا صدمے سہتا ہوں
سنگینوں کے راج میں بھی سچ کہتا ہوں
میری راہ میں مصلحتوں کے پھول بھی ہیں
تیری خاطر کانٹے چنتا رہتا ہوں
تو آئے گا' اسی آس پر جھوم رہا ہے دل
دیکھ اے مستقبل

اک اک کر کے سارے ساتھی چھوڑ گئے
مجھ سے میرے رہبر بھی منہ موڑ گئے
سوچتا ہوں بے کار گِلہ ہے غیروں کا
اپنے ہی جب پیار کا ناتا توڑ گئے
تیرے بھی دشمن ہیں میرے خوابوں کے قاتل
دیکھ اے مستقبل

جہل کے آگے سر نہ جھکایا میں نے کبھی
سِفلوں کو اپنا نہ بنایا میں نے کبھی
دولت اور عہدوں کے بل پر جو اینٹھیں
ان لوگوں کو منہ نہ لگایا میں نے کبھی
میں نے چور کہا چوروں کو کھل کے سرِ محفل
دیکھ اے مستقبل

زلف کی بات کیے جاتے ہیں
دن کو یوں رات کیے جاتے ہیں
چند آنسو ہیں، انہیں بھی جالبؔ
نذرِ حالات کیے جاتے ہیں

نام کیا لوں

ایک عورت جو میرے لئے مُدّتوں
شمع کی طرح آنسو بہاتی رہی
میری خاطر زمانے سے منہ موڑ کر
میرے ہی پیار کے گیت گاتی رہی
میرے غم کو مقدّر بنائے ہوئے
مسکراتی رہی
اس کے غم کی کبھی میں نے پروا نہ کی
اس نے ہر حال میں نام میرا لیا
چھین کر اس کے ہونٹوں کی میں نے ہنسی
تیری دہلیز پر اپنا سر رکھ دیا
تو نے میری طرح میرا دل توڑ کر
مجھ پہ احساں کیا

یُوری گیگرین

موت کے بیاباں سے زندگی گزر آئی
ظلمتوں کے صحرا میں روشنی نظر آئی

آدمی کی راہوں میں گرد ہیں مہ و انجم
ماورائے امکاں سے ہم کو یہ خبر آئی

صبح و شام لرزاں تھے سامنے نگاہوں کے
اہلِ دل کی منزل میں وہ بھی رہ گزر آئی

جب سے دکھ زمانے کے ہمسفر بنائے ہیں
چھب مرے خیالوں کی اور بھی نکھر آئی

○

مری نگاہ سے وہ دیکھتے رہے ہیں مجھے
رہا ہوں میں بھی کبھی اس نگاہ کا معیار
یہاں نہ تلخ نوائی سے کام لو جالبؔ
رہینِ درد نہیں ہیں بستیاں یہ دیار

○

اشک آنکھوں میں اب ہیں آئے سے
بات چھپتی نہیں چھپائے سے
اپنی باتیں کہیں تو کس سے کہیں
سب یہاں لوگ ہیں پرائے سے

○

نت نئے شہر نت نئی دُنیا
ہم کو آوارگی سے پیار رہا
ان کے آنے کے بعد بھی جالبؔ
دیر تک ان کا انتظار رہا

○

کوچۂ صبح میں جا پہنچے ہم
صورت موجِ صبا پہنچے ہم
نزہتِ گل کا پیام آیا تھا
لاکھ تھے آبلہ پا، پہنچے ہم

○

تیری بستی میں جدھر سے گزرے
ہائے کیا لوگ نظر سے گزرے
کتنی یادوں نے ہمیں تھام لیا
ہم جو اُس راہ گزر سے گزرے

○

سو گئے انجمِ شب یاد نہ آ
اے مری جانِ طرب یاد نہ آ
مری پتھرائی ہوئی آنکھوں میں
کوئی آنسو نہیں اب یاد نہ آ

○

ڈوب جائے گا آج بھی خورشید
آج بھی تم نظر نہ آؤ گے
بیت جائے گی اس طرح ہر شام
زندگی بھر ہمیں رُلاؤ گے

○

غم کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو
تم مرے ساتھ چل سکو تو چلو
دور تک تیرگی میں چلنا ہے
صورتِ شمع جل سکو تو چلو

○

دوستو مشورے نہ دو ہم کو
مشوروں سے دماغ جلتا ہے
یہ کسی نے غلط کہا تم سے
ان کھلونوں سے جی بہلتا ہے

○

جہاں آساں تھا دن کو رات کرنا
وہ گلیاں ہوگئی ہیں ایک سپنا
اب ان کی یاد ہے پلکوں پہ روشن
اب ان کو کہہ نہیں سکتے ہم اپنا

○

سبزہ زاروں میں گزر تھا اپنا
مست و شاداب نگر تھا اپنا
جب اٹھاتا ہے کوئی محفل سے
یاد آتا ہے کہ گھر تھا اپنا

○

تجھے پایا کہ تجھ کو کھو دیا ہے
یہ اکثر سوچ کر دل رو دیا ہے
ہمارا داغِ دل جائے نہ جائے
ترا دامن تو ہم نے دھو دیا ہے

○

دیارِ سبزہ و گُل سے نکل کر
دل و جاں نذرِ صحرا ہوگئے ہیں
کہاں وہ چاند سی ہنستی جبینیں
گھنی تاریکیوں میں کھو گئے ہیں

○

مدتیں ہوگئیں خطا کرتے
شرم آتی ہے اب دعا کرتے
چاند تارے بھی ان کا اے جالبؔ
تھرتھراتے ہیں سامنا کرتے

○

رنگ و بوئے گلاب کہہ لوں گا
موجِ جامِ شراب کہہ لوں گا
لوگ کہتے ہیں تیرا نام نہ لوں
میں تجھے ماہتاب کہہ لوں گا

دستور

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا' میں نہیں مانتا
میں بھی خائف نہیں تختہ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو' جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا' میں نہیں مانتا

پھول شاخوں پہ کھلنے لگے، تم کہو
جام رندوں کو ملنے لگے، تم کہو
چاک سینوں کے سلنے لگے، تم کہو
اِس کھُلے جھوٹ کو، ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

تم نے لوُٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمہارا افسوں
چارہ گر میں تمہیں کس طرح سے کہوں
تم نہیں چارہ گر، کوئی مانے، مگر
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

جمہوریت

دس کروڑ انسانو!
زندگی سے بیگانو!
صرف چند لوگوں نے حق تمہارا چھینا ہے
خاک ایسے جینے پر یہ بھی کوئی جینا ہے
بے شعور بھی تم کو بے شعور کہتے ہیں
سوچتا ہوں یہ ناداں کس ہوا میں رہتے ہیں
اور یہ قصیدہ گو فکر ہے یہی جن کو
ہاتھ میں عَلَم لے کر تم نہ اُٹھ سکو لوگو
کب تلک یہ خاموشی چلتے پھرتے زندانو
دس کروڑ انسانو!
یہ ملیں یہ جاگیریں کس کا خون پیتی ہیں
بیرکوں میں یہ فوجیں کس کے بل پہ جیتی ہیں
کس کی محنتوں کا پھل داشتائیں کھاتی ہیں
جھونپڑوں سے رونے کی کیوں صدائیں آتی ہیں
جب شباب پر آکر کھیت لہلہاتا ہے
کس کے نین روتے ہیں کون مُسکراتا ہے
کاش تم کبھی سمجھو کاش تم کبھی جانو
دس کروڑ انسانو!

علم و فن کے رستے میں لاٹھیوں کی یہ باڑیں
کالجوں کے لڑکوں پر گولیوں کی بوچھاڑیں
یہ کرائے کے غنڈے یادگارِ شب دیکھو
کس قدر بھیانک ہے ظلم کا یہ ڈھب دیکھو
رقصِ آتش و آہن دیکھتے ہی جاؤ گے
دیکھتے ہی جاؤ گے ہوش میں نہ آؤ گے

اے خموش طوفانو!
دس کروڑ انسانو!

سینکڑوں حسن ناصرؔ ہیں شکار نفرت کے
صبح و شام لٹتے ہیں قافلے محبت کے
جب سے کالے باغوں نے آدمی کو گھیرا ہے
مشعلیں کرو روشن دور تک اندھیرا ہے
میرے دیس کی دھرتی پیار کو ترستی ہے
پتھروں کی بارش ہی اس پہ کیوں برستی ہے
مُلک کو بچاؤ بھی ملک کے نگہبانو

دس کروڑ انسانو!

بولنے پہ پابندی سوچنے پہ تعزیریں
پاؤں میں غلامی کی آج بھی ہیں زنجیریں
آج حرفِ آخر ہے بات چند لوگوں کی
دن ہے چند لوگوں کا رات چند لوگوں کی
اُٹھ کے درد مندوں کے صبح و شام بدلو بھی
جس میں تم نہیں شامل وہ نظام بدلو بھی
دوستوں کو پہچانو دشمنوں کو پہچانو
دس کروڑ انسانو!

اپنی جنگ رہے گی

جب تک چند لٹیرے اِس دھرتی کو گھیرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی
اہلِ ہوس نے جب تک اپنے دام بکھیرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی
مغرب کے چہرے پر یارو اپنے خون کی لالی ہے
لیکن اب اس کے سورج کی ناؤ ڈوبنے والی ہے
مشرق کی تقدیر میں جب تک غم کے اندھیرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی
ظلم کہیں بھی ہو ہم اس کا سر خم کرتے جائیں گے
محلوں میں اب اپنے لہو کے دیئے نہ جلنے پائیں گے
کٹیاؤں سے جب تک صبحوں نے منہ پھیرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی
جان لیا اے اہلِ کرم تم ٹولی ہو عیاروں کی
دستِ نگر کیوں بنکے رہے یہ بستی ہے خودداروں کی
ڈوبے ہوئے دُکھ درد میں جب تک سانجھ سویرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی

بھیک نہ مانگو

پاکستان کی غیرت کے رکھوالو
بھیک نہ مانگو
توڑ کے اس کشکول کو آدھی کھالو
بھیک نہ مانگو
اپنے بل پر چلنا کب سیکھو گے
طوفانوں میں پلنا کب سیکھو گے
یہ کہنہ تقدیر کا شکوہ کب تک
اس کو آپ بدلنا کب سیکھو گے
خود اپنی بگڑی تقدیر بنالو
بھیک نہ مانگو
یہ جو راہ میں کالے باغ کھڑے ہیں
کب یہ آزادی کی جنگ لڑے ہیں
جن کا آزادی میں خون ہے شامل
جب تک جیلوں میں وہ لوگ پڑے ہیں
وقت کٹھن ہے دیس کی آن بچالو
بھیک نہ مانگو

انگریزوں کے پٹھّو کہلاؤنا
امریکہ کے تلوے سہلاؤنا
آج تلک ان کے دھوکے کھائے ہیں
اور مگر ان کے دھوکے کھاؤنا
آزادی کے سر پہ خاک نہ ڈالو
بھیک نہ مانگو

بیس گھرانے

بیس گھرانے ہیں آباد
اور کروڑوں ہیں ناشاد
صدر ایوب زندہ باد

آج بھی ہم پر جاری ہے
کالی صدیوں کی بیداد
صدر ایوب زندہ باد

بیس روپیہ من آٹا
اس پر بھی ہے سناٹا
گوہر، سہگل، آدم جی
بنے ہیں برلا اور ٹاٹا

ملک کے دشمن کہلاتے ہیں
جب ہم کرتے ہیں فریاد

صدر ایوب زندہ باد

لائسنسوں کا موسم ہے
کنونشن کو کیا غم ہے
آج حکومت کے در پر
ہر شاہیں کا سر خم ہے
درسِ خودی دینے والوں کو
بھول گئی اقبال کی یاد

صدر ایوب زندہ باد

عام ہوئی غنڈہ گردی
چپ ہیں سپاہی باوردی
شمعِ نوائے اہلِ سُخن
کالے باغ نے گُل کردی
اہلِ قفس کی قید بڑھا کر
کم کرلی اپنی میعاد

صدر ایوب زندہ باد

یہ میثاقِ استنبول
کیا کھولوں میں اس کا پول
بجتا رہے گا محلوں میں
کب تک یہ بے ہنگم ڈھول
سارے عرب ناراض ہوئے ہیں
سیٹو اور سنٹو ہیں شاد

صدر ایوب زندہ باد

گلی گلی میں جنگ ہوئی
خلقت دیکھ کے دنگ ہوئی
اہل نظر کی ہر بستی
جہل کے ہاتھوں تنگ ہوئی
وہ دستور ہمیں بخشا ہے
نفرت ہے جس کی بنیاد

صدر ایوب زندہ باد

مشیر

میں نے اُس سے یہ کہا

یہ جو دس کروڑ ہیں
جہل کا نچوڑ ہیں
ان کی فکر سو گئی
ہر امید کی کرن
ظلمتوں میں کھو گئی
یہ خبر درست ہے
ان کی موت ہو گئی
بے شعور لوگ ہیں
زندگی کا روگ ہیں

اور تیرے پاس ہے
ان کے درد کی دوا
میں نے اُس سے یہ کہا
تو خدا کا نور ہے
عقل ہے شعور ہے
قوم تیرے ساتھ ہے
تیرے ہی وجود سے
ملک کی نجات ہے
تو ہے مہرِ صبحِ نو
تیرے بعد رات ہے
بولتے جو چند ہیں
سب یہ شرپسند ہیں
ان کی کھینچ لے زباں
ان کا گھونٹ دے گلا
میں نے اُس سے یہ کہا

جن کو تھا زباں پہ ناز
چُپ ہیں وہ زباں دراز
چَین ہے سماج میں
بے مثال فرق ہے
کل میں اور آج میں
اپنے خرچ پر ہیں قید
لوگ تیرے راج میں
آدمی ہے وہ بڑا
در پہ جو رہے پڑا
جو پناہ مانگ لے
اُس کی بخشش دے خطا

میں نے اُس سے یہ کہا

ہر وزیر ہر سفیر
بے نظیر ہے مشیر
واہ کیا جواب ہے
تیرے ذہن کی قسم
خوب انتخاب ہے
جاگتی ہے افسری

قوم محوِ خواب ہے
یہ ترا وزیر خاں
دے رہا ہے جو بیاں
پڑھ کے ان کو ہر کوئی
کہہ رہا ہے مرحبا
میں نے اُس سے یہ کہا

چین اپنا یار ہے
اس پہ جاں نثار ہے
پر وہاں ہے جو نظام
اس طرف نہ جائیو
اس کو دُور سے سلام
دس کروڑ یہ گدھے
جن کا نام ہے عوام
کیا بنیں گے حکمراں
تُو "یقیں" ہے یہ "گماں"
اپنی تو دُعا ہے یہ
صدر تو رہے سدا
میں نے اُس سے یہ کہا

وطن کو کچھ نہیں خطرہ

وطن کو کچھ نہیں خطرہ نظامِ زر ہے خطرے میں
حقیقت میں جو رہزن ہے وہی رہبر ہے خطرے میں

جو بیٹھا ہے صفِ ماتم بچھائے مرگِ ظلمت پر
وہ نوحہ گر ہے خطرے میں، وہ دانشور ہے خطرے میں

اگر تشویش لاحق ہے تو سلطانوں کو لاحق ہے
نہ تیرا گھر ہے خطرے میں نہ میرا گھر ہے خطرے میں

جہاں اقبالؔ بھی نذرِ خطِ تنسیخ ہو جالبؔ
وہاں تجھ کو شکایت ہے ترا جوہر ہے خطرے میں

تم سے امیدِ خیر لا حاصل
بے ضمیری جسے گوارا ہو
بس وہی ہم سفر تمہارا ہو

ضبط کرتے ہو روز تم اخبار
یہ ہے آزادیٔ لبِ اظہار

مفلس و اہلِ دانش و زردار
آج ہیں تم سے سب کے سب بیزار

سچ نہ بولا نہ بول سکتے ہو
جانے کیا کیا جنوں میں بکتے ہو

تالیاں قہقہے کرو تقریر
کوئی کچھ بھی کہے کرو تقریر

ملک کٹتا رہے کرو تقریر
خون بہتا بہے کرو تقریر

سب ہیں خوشحال ہاتھ اٹھواؤ
یوں تماشا جہاں کو دکھلاؤ

دل تمہارے ہیں نفرتوں سے بھرے
کون اب تم پہ اعتبار کرے

جو بھی تم سے ملائے ہاتھ ڈرے
مرگئے اچھے لوگ تم نہ مرے

قاتلو اب خدا سے کچھ تو ڈرو
باقی ماندہ وطن پہ رحم کرو

قصّہ خوانی کے شہیدوں کی نذر

گولیاں تم پہ چلانے والے اب تک زندہ ہیں
قصّہ خوانی کے شہیدو، تم سے ہم شرمندہ ہیں

ہے خزاں کی دسترس میں صحنِ گلشن آج بھی
اور کانٹوں سے بھرا ہے اپنا دامن آج بھی
کل بھی تھے جو صاحبِ اقبال چشمِ غیر سے
اُن کی قسمت کے ستارے آج بھی تابندہ ہیں
قصّہ خوانی کے شہیدو تم سے ہم شرمندہ ہیں

سر نہیں تم نے جُھکایا، اپنا سر کٹوالیا
جان دے دی اور حیاتِ جاوداں کو پالیا
ہم غلاموں کی بھی کوئی زندگی ہے دہر میں
نقش جو چھوڑے ہیں تم نے بس وہی پائندہ ہیں
قصہ خوانی کے شہیدو تم سے ہم شرمندہ ہیں

کراچی میں جب صاحبِ جاہ نے
جھونپڑے جلائے

شیمنوں کو جلا کر کیا چراغاں خوب
سنوارتے ہیں یونہی چہرۂ گلستاں خوب

کھلا کے شاخِ دل و جاں پہ پھول زخموں کے
مسرّتوں کو کیا آپ نے نمایاں خوب

لہو اُچھال کے اہلِ وفا کا راہوں میں
قدم قدم پہ کیا پاسِ دلفگاراں خوب

مچی ہے چاروں طرف آپ کے کرم کی دھوم
نبھائے آپ نے الفت کے عہد و پیماں خوب

ہر ایک بجھتا ہوا دیپ کہہ رہا ہے یہی
تمام رات رہا جشنِ نو بہاراں خوب

فرضی مقدّمات میں جھوٹی شہادتیں
ہم پھر بھی لکھ رہے ہیں جنوں کی حکایتیں

مجرم کی اب نشان دہی کون کر سکے
اب تک ہیں بند اہلِ قلم کی عدالتیں

زنجیرِ پا جو توڑ رہے ہیں قفس نصیب
ہیں اہلِ آشیاں کی نظر میں بغاوتیں

پہنچے ہیں اہلِ جور صلیبیں لئے ہوئے
آئی ہیں جب بھی سامنے کھل کر صداقتیں

جو لوگ جھونپڑوں میں پڑے تھے پڑے رہے
کچھ اہلِ زر نے اور بنالیں عمارتیں

آیا ہی چاہتا ہے اب اہلِ خرد کا دور
مسند نشیں رہیں گی کہاں تک جہالتیں

جالبؔ بزرگ کیوں ہیں خفا بات بات پر
کرتا رہا ہے یوں ہی لڑکپن شرارتیں

وطن سے الفت ہے جرُم اپنا یہ جرم تا زندگی کریں گے
ہے کس کی گردن پہ خونِ ناحق یہ فیصلہ لوگ ہی کریں گے

وطن پرستوں کو کہہ رہے ہو وطن کا دشمن ڈرو خدا سے
جو آج ہم سے خطا ہوئی ہے یہی خطا کل سبھی کریں گے

وظیفہ خواروں سے کیا شکایت ہزار دیں شاہ کو دعائیں
مدار جن کا ہے نوکری پر وہ لوگ تو نوکری کریں گے

لئے جو پھرتے ہیں تمغۂ فن' رہے ہیں جو ہم خیالِ رہزن
ہماری آزادیوں کے دشمن ہماری کیا رہبری کریں گے

نہ خوفِ زنداں نہ دار کا غم یہ بات دُہرا رہے ہیں پھر ہم
کہ آخری فیصلہ وہ ہوگا جو دس کروڑ آدمی کریں گے

ستم گروں کے ستم کے آگے نہ سر جُھکا ہے نہ جُھک سکے گا
شعارِ صادق پہ ہم ہیں نازاں جو کہہ رہے ہیں وہی کریں گے

یہ لوگ کچھ کم نگاہ جن کو سمجھ رہے ہیں کہ ناسمجھ ہیں
یہی زمانے میں عام جالبؔ شعور کی روشنی کریں گے

نہ گفتگو سے نہ وہ شاعری سے جائے گا
عصا اٹھاؤ کہ فرعون اسی سے جائے گا

اگر ہے فکرِ گریباں تو گھر میں جابیٹھو
یہ وہ عذاب ہے، دیوانگی سے جائے گا

بجھے چراغ، لُٹیں عِصمتیں، چمن اجڑا
یہ رنج جس نے دیئے، کب خوشی سے جائے گا

جیو ہماری طرح سے مرو ہماری طرح
نظامِ زر تو اسی سادگی سے جائے گا

جگا نہ شہ کے مصاحب کو خواب سے جالبؔ
اگر وہ جاگ اٹھا، نوکری سے جائے گا

کہاں قاتل بدلتے ہیں، فقط چہرے بدلتے ہیں
عجب اپنا سفر ہے، فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں

بہت کم ظرف تھا جو محفلوں کو کرگیا ویراں
نہ پوچھو حالِ یاراں شام کو جب سائے ڈھلتے ہیں

وہ جس کی روشنی کچّے گھروں تک بھی پہنچتی ہے
نہ وہ سُورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں

کہاں تک دوستوں کی بیدلی کا ہم کریں ماتم
چلو اس بار بھی ہم ہی سرِ مقتل نکلتے ہیں

ہمیشہ اَوج پر دیکھا مقدر اُن ادیبوں کا
جو ابن الوقت ہوتے ہیں ہوا کے ساتھ چلتے ہیں

بہر صورت مسائل کو تو حل کرنا ہی پڑتا ہے
مسائل ایسے سائل ہیں کہاں ٹالے سے ٹلتے ہیں

ہم اہلِ درد نے یہ راز آخر پالیا جالبؔ
کہ دیپ اونچے مکانوں میں ہمارے خُوں سے جلتے ہیں

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ
وہ کہاں ہیں کہ جنہیں ناز بہت اپنے تئیں تھا

آج سوئے ہیں تہِ خاک نہ جانے یہاں کتنے
کوئی شعلہ، کوئی شبنم، کوئی مہتاب جبیں تھا

اب وہ پھرتے ہیں اسی شہر میں تنہا لئے دل کو
اک زمانے میں مزاج ان کا سرِ عرشِ بریں تھا

چھوڑنا گھر کا ہمیں یاد ہے جالبؔ نہیں بھولے
تھا وطن ذہن میں اپنے کوئی زنداں تو نہیں تھا

اپنی بات کرو

چھوڑو قصہ زرداروں کا اپنی بات کرو
نام نہ لو ان بدکاروں کا اپنی بات کرو

کل جو ہم پر چلی تھی گولی آج بھی وہی چلی
نوابوں کے وعدوں سے کب غم کی شام ڈھلی

کوئی نہیں ہم دکھیاروں کا اپنی بات کرو
چھوڑو قصہ زرداروں کا اپنی بات کرو

حال ہمارا کیا جانے گا کوئی دھن والا
آپ ہی آئیں گے تو ہوگا جیون اجالا

گیا زمانہ سرداروں کا اپنی بات کرو
چھوڑو قصہ زرداروں کا اپنی بات کرو

رنگ برنگی کاروں والے آخر اپنے کون
یہ تو صورت ہی سے مجھ کو لگتے ہیں فرعون

ساتھ نہ دو ان خونخواروں کا اپنی بات کرو
چھوڑو قصہ زرداروں کا اپنی بات کرو

اس رعونت سے وہ جیتے ہیں کہ مرنا ہی نہیں
تخت پر بیٹھے ہیں یوں جیسے اترنا ہی نہیں

یوں مہ و انجم کی وادی میں اُڑے پھرتے ہیں وہ
خاک کے ذرّوں پہ جیسے پاؤں دھرنا ہی نہیں

ان کا دعوٰی ہے کہ سورج بھی انہی کا ہے غلام
شب جو ہم پر آئی ہے اس کو گزرنا ہی نہیں

کیا علاج اس کا اگر ہو مدّعا ان کا یہی
اہتمامِ رنگ و بو گلشن میں کرنا ہی نہیں

ظلم سے ہیں برسرِ پیکار آزادی پسند
اُن پہاڑوں میں جہاں پر کوئی جھرنا ہی نہیں

دل بھی اُن کے ہیں سیہ خوراک زنداں کی طرح
ان سے اپنا غم بیاں اب ہم کو کرنا ہی نہیں

انتہا کرلیں ستم کی لوگ ابھی ہیں خواب میں
جاگ اُٹھے جب لوگ تو اُن کو ٹھہرنا ہی نہیں

آگ ہے پھیلی ہوئی کالی گھٹاؤں کی جگہ
بد دعائیں ہیں لبوں پر اب دعاؤں کی جگہ

اِنتخاب اہلِ گلشن پر بہت روتا ہے دل
دیکھ کر زاغ و زغن کو خوش نواؤں کی جگہ

کچھ بھی ہوتا پر نہ ہوتے پارہ پارہ جسم و جاں
راہزن ہوتے اگر ان رہنماؤں کی جگہ

لُٹ گئی اس دور میں اہلِ قلم کی آبرو
بک رہے ہیں اب صحافی بیسواؤں کی جگہ

کچھ تو آتا ہم کو بھی جاں سے گزرنے کا مزہ
غیر ہوتے کاش جالبؔ آشناؤں کی جگہ

میں غزل کہوں تو کیسے کہ جدا ہیں میری راہیں
مرے ارد گرد آنسو، مرے آس پاس آہیں

نہ وہ عارضوں کی صبحیں نہ وہ گیسوؤں کی شامیں
کہیں دور رہ گئی ہیں مرے شوق کی پناہیں

نہ فریب دے سکے گی ہمیں اب کسی کی چاہت
کہ رُلا چکی ہیں ہم کو تری کم سخن نگاہیں

کہیں گیس کا دھواں ہے کہیں گولیوں کی بارش
شبِ عہدِ کم نگاہی تجھے کس طرح سراہیں

کوئی دم کی رات ہے یہ کوئی پل کی بات ہے یہ
نہ رہے گا کوئی قاتل نہ رہیں گی قتل گاہیں

میں زمیں کا آدمی ہوں مجھے کام ہے زمیں سے
یہ فلک پہ رہنے والے مجھے چاہیں یا نہ چاہیں

نہ مذاق اُڑا سکیں گے مری مفلسی کا جالبؔ
یہ بلند بام ایواں یہ عظیم بارگاہیں

آج کل

قانون اہلِ جور نے ایسے بنا دیئے
لرزاں عدالتوں کے ترازو ہیں آج کل
مسند نشیں ہوئی ہے تب و تابِ شیطنت
انسانیت کی آنکھ میں آنسو ہیں آج کل

وطن فروش

اصول بیچ کے مسند خریدنے والو
نگاہ اہلِ وفا میں بہت حقیر ہو تم
وطن کا پاس تمہیں تھا نہ ہوسکے گا کبھی
کہ اپنی حرص کے بندے ہو بے ضمیر ہو تم

رحم آتا ہے

ہر ایک شاخ پہ برق تپاں ہے رقص کناں
فضائے صحن چمن تجھ پہ رحم آتا ہے
قدم قدم پہ یہاں پر ضمیر بکتے ہیں
مرے عظیم وطن تجھ پہ رحم آتا ہے

فصل قرار آئے گی

ڈھلے گی شام، سحر نغمہ بار آئے گی
ہم آئیں گے تو چمن میں بہار آئے گی
امید، عہد ستم کے گماشتوں سے نہ رکھ
ہمارے ساتھ ہی فصلِ بہار آئے گی

غم یہاں پر وہاں پہ شادی ہے
مسئلہ سارا اقتصادی ہے

پاکستان کا مطلب کیا؟

روٹی، کپڑا اور دوا
گھر رہنے کو چھوٹا سا
مفت مجھے تعلیم دلا
میں بھی مسلماں ہوں واللہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ ...

امریکہ سے مانگ نہ بھیک
مت کر لوگوں کی تضحیک
روک نہ جمہوری تحریک
چھوڑ نہ آزادی کی راہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ ...

کھیت وڈیروں سے لے لو
ملیں لٹیروں سے لے لو
مُلک اندھیروں سے لے لو
رہے نہ کوئی عالی جاہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ.........

سرحد، سندھ، بلوچستان
تینوں ہیں پنجاب کی جان
اور بنگال ہے سب کی آن
آئے نہ ان کے لب پر آہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ.........

بات یہی ہے بنیادی
لوگوں کو ہو آزادی
غاصب کی ہو بربادی
حق کہتے ہیں حق آگاہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ.........

خطرے میں اِسلام نہیں

خطرہ ہے زرداروں کو
گرتی ہوئی دیواروں کو
صدیوں کے بیماروں کو
خطرہ میں اسلام نہیں
ساری زمیں کو گھیرے ہوئے ہیں آخر چند گھرانے کیوں
نام نبی کا لینے والے الفت سے بیگانے کیوں
خطرہ ہے خوں خواروں کو
رنگ برنگی کاروں کو
امریکہ کے پیاروں کو
خطرے میں اسلام نہیں
آج ہمارے نعروں سے لرزہ ہے بپا ایوانوں میں
بِک نہ سکیں گے حسرت و ارماں اونچی سجی دکانوں میں

خطرہ ہے بٹ ماروں کو
مغرب کے بازاروں کو
چوروں کو مکّاروں کو
خطرے میں اسلام نہیں
امن کا پرچم لے کر اٹھو ہر انساں سے پیار کرو
اپنا تو منشور ہے جالبؔ سارے جہاں سے پیار کرو

خطرہ ہے درباروں کو
شاہوں کے غمخواروں کو
نوابوں، غدّاروں کو
خطرے میں اسلام نہیں

علمائے سُو کے نام

امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتویٰ
نہیں ہے دیں فروشو! ہم پہ یہ کوئی نیا فتویٰ

سفینہ اہلِ زر کا ڈوبنے والا ہے شب زادو
کوئی فتویٰ بچا سکتا نہیں جاگیرداروں کو
بہت خوں پی چُکے ہو اپنا بھی انجام اب دیکھو

تمہاری حیثیت کیا' کون ہو تُم اور کیا فتویٰ
امیروں کی حمایت میں. دیا تم نے سدا فتویٰ

رضائے ایزدی تم نے کہا دینِ الٰہی کو
نہیں مٹنے دیا تم نے نظامِ کجکُلاَ ہی کو
دیا تم نے سہارا ہر قدم پر زار شاہی کو

مگر انسانیت کے سامنے کس کا چلا فتویٰ
امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتویٰ

کہا تم نے کہ جائز ہے فرنگی کی وفاداری
بنایا تم نے ہر اک عہد میں مذہب کو سرکاری
لئے پرمٹ دیئے فتوے رکھی ایوّب سے یاری

دکاں کھولو نئی، جاؤ پرانا ہوچکا فتویٰ
امیروں کی حمایت میں دیا تم نے سدا فتویٰ

مولانا

بہت میں نے سنی ہے آپ کی تقریر مولانا
مگر بدلی نہیں اب تک مری تقدیر مولانا

خدارا شُکر کی تلقین اپنے پاس ہی رکھیں
یہ لگتی ہے مرے سینے پہ بن کر تیر مولانا

نہیں میں بول سکتا جھوٹ اس درجہ ڈھٹائی سے
یہی ہے جرم میرا اور یہی تقصیر مولانا

حقیقت کیا ہے یہ تو آپ جانیں یا خدا جانے
سُنا ہے جمیؔ کارٹر آپ کا ہے پیر مولانا

زمینیں ہوں وڈیروں کی مشینیں ہوں لٹیروں کی
خدا نے لکھ کے دی ہے یہ تمہیں تحریر مولانا

کروڑوں کیوں نہیں مِل کر فلسطیں کے لئے لڑتے
دعا ہی سے فقط کٹتی نہیں زنجیر مولانا

○

میں تو سورج ہوں، ستارے مرے آگے کیا ہیں
شب ہے کیا شب کے سہارے مرے آگے کیا ہیں
جو ہمیشہ رہے شاہوں کے ثنا خواں جالبؔ
وہ سخن ساز بچارے مرے آگے کیا ہیں

○

اشکوں کے جگنوؤں سے اندھیرا نہ جائے گا
شب کا حصار توڑ کوئی آفتاب لا
ہر عہد میں رہا ہوں میں لوگوں کے درمیاں
میری مثال دے کوئی میرا جواب لا

شہر بدر طلباء کے نام

فضاء میں اپنا لہو جس نے بھی اچھال دیا
ستم گروں نے اسے شہر سے نکال دیا
یہی تو ہم سے رفیقانِ شب کو شکوہ ہے
کہ ہم نے صبح کے رستے پہ خود کو ڈال دیا

کتنے خاموش تھے چپ چاپ تھے' رستے گلیاں
یہ زمیں بول اُٹھی میرے سخن سے یارو
ملک میں عام کریں اپنے قلم کی دولت
یہ گزارش ہے مری اہلِ سخن سے یارو

جواں آگ

گولیوں سے یہ جواں آگ نہ بجھ پائے گی
گیس پھینکو گے تو کچھ اور بھی لہرائے گی

یہ جواں آگ جو ہر شہر میں جاگ اٹھّی ہے
تیرگی دیکھ کے اس آگ کو بھاگ اٹھّی ہے

کب تلک اس سے بچاؤ گے تم اپنے داماں
یہ جواں آگ جلا دے گی تمہارے ایواں

یہ جواں خون بہایا ہے جو تم نے اکثر
یہ جواں خون نکل آیا ہے بن کے لشکر

یہ جواں خون سیہ رات نہ رہنے دے گا
دکھ میں ڈوبے ہوئے حالات نہ رہنے دے گا

یہ جواں خون ہے محلوں پہ لپکتا طوفاں
اس کی یلغار سے ہر اہلِ ستم ہے لرزاں

یہ جواں فکر تمہیں خون نہ پینے دے گی
غاصبو! اب نہ تمہیں چین سے جینے دے گی

قاتلو! راہ سے ہٹ جاؤ کہ ہم آتے ہیں
اپنے ہاتھوں میں لئے سرخ علم آتے ہیں

توڑ دے گی یہ جواں فکر حصارِ زنداں
جاگ اُٹھے ہیں میرے دیس کے بیکس انساں

طلبہ کے نام

افسوس تمہیں کار کے شیشے کا ہوا ہے
پروا نہیں اک ماں کا جو دل ٹوٹ گیا ہے
ہوتا ہے اثر تم پہ کہاں نالۂ غم کا
برہم جو ہوئی بزم طرب اس کا گِلا ہے
فرعون بھی نمرود بھی گزرے ہیں جہاں میں
رہتا ہے یہاں کون یہاں کون رہا ہے
تم ظلم کہاں تک تہِ افلاک کرو گے
یہ بات نہ بھولو کہ ہمارا بھی خدا ہے
آزادیٔ انساں کے وہیں پھول کھلیں گے
جس جا پہ ظہیر آج ترا خون گرا ہے
تاچند رہے گی یہ شبِ غم کی سیاہی
رستہ کوئی سورج کا کہیں روک سکا ہے
تو آج کا شاعر ہے تو کر میری طرح بات
جیسے مرے ہونٹوں پہ مرے دل کی صدا ہے

گھیراؤ

صدیوں سے گھیراؤ میں ہم تھے، ہمیں بچانے کوئی نہ آیا
کچھ دن ہم نے گھیرا ڈالا، ہر ظالم نے شور مچایا
پھر ہم نے زنجیریں پہنیں، ہر سُو پھیلا چپ کا سایا

پھر توڑیں گے ہم زنجیریں، ہر لب کو آزاد کریں گے
جان پہ اپنی کھیل کے پھر ہم شہرِ وفا آباد کریں گے
آخر کب تک چند گھرانے لوگوں پر بیداد کریں گے

امریکہ کے ایجنٹوں سے ملک بچانا ہے ہم کو
گلی گلی میں آزادی کا دیپ جلانا ہے ہم کو

جن کے کارن اپنے وطن میں گھر گھر آج اندھیارا ہے
اُن کالی دیواروں کو رستے سے ہٹانا ہے ہم کو

نوکر شاہی اصل میں پیارے انگریزوں کی لعنت ہے
اس انگریزی لعنت کا ہر اک نقش مٹانا ہے ہم کو

بیڑا غرق جو کر دے ساتھی اس امریکی بیڑے کا
بحرِ ہند میں اک ایسا طوفان اٹھانا ہے ہم کو

ایڈ کی گندم کھا کر ہم نے کتنے دھوکے کھائے ہیں
پوچھ نہ ہم نے امریکہ کے کتنے ناز اٹھائے ہیں

پھر بھی اب تک وادیٔ گل کو سنگینوں نے گھیرا ہے
ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے

خان بہادر چھوڑنا ہوگا اب تو ساتھ انگریزوں کا
تا بہ گریباں آپہنچا ہے پھر سے ہاتھ انگریزوں کا

میکملن تیرا نہ ہوا تو کینیڈی کب تیرا ہے
ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے

یہ دھرتی ہے اصل میں پیارے مزدوروں دہقانوں کی
اس دھرتی پر چل نہ سکے گی مرضی چند گھرانوں کی

ظلم کی رات رہے گی کب تک اب نزدیک سویرا ہے
ہندوستان بھی میرا ہے اور پاکستان بھی میرا ہے

سفید بینا

قرض دے کر غریب ملکوں کو
چھین لیتا ہے روحِ آزادی
آج زیرِ عتاب ہے اس کے
ہر بڑا شہر ہر حسیں وادی

مدّتوں سر اٹھا کے چل نہ سکا
اس کے کھاتے میں جس کا نام آیا
صاف دامن بچا گیا ہم سے
جب بھی مشکل کوئی مقام آیا
بحرِ ہند آج تیری موجیں بھی
اس کی توپوں کے سائے میں ہیں خموش
کوئی طوفان کیوں نہیں اٹھتا
کیا ہوا آج تیرا جوش و خروش

آپ چین ہو آئے آپ روس ہو آئے

اب بھی پیٹ کی خاطر بک رہی ہے مجبوری
اب بھی ہے غریبوں کی اشک و آہ مزدوری
اب بھی جھونپڑوں سے ہے نُور عِلم کی دوری
آج بھی لبوں پر ہے داستانِ مہجوری
آج بھی مسلّط ہیں سامراج کے سائے
آپ چین ہو آئے آپ روس ہو آئے

توڑتے ہیں دم مفلس ہسپتال کے در پر
چارہ گر بھی ان کے ہیں جن کی جیب میں ہے زر
پارکوں میں سوتے ہیں کتنے نوجواں بے گھر
یہ بھی چاہتے ہوں گے ہم چلیں اٹھا کے سر
کتنے پھول مرجھائے کتنے چاند گہنائے
آپ چین ہو آئے آپ روس ہو آئے

ہم کبھی نہ چھوڑیں گے بات برملا کہنا
ہاں نہیں شعار اپنا درد کو دوا کہنا
گر عوام خوش ہوں گے ہم کہیں گے کیا کہنا
جھوٹ ہے خوشامد ہے، "فخرِ ایشیاء" کہنا
رہنُما وہی ہے جو فخرِ مُلک کہلائے
آپ چین ہو آئے آپ روس ہو آئے

امریکہ یاترا کے خلاف

طوافِ کوئے ملامت کو پھر نہ جا اے دل
نہ اپنے ساتھ ہماری بھی خاک اڑا اے دل

نہیں ہے کوئی وہاں درد آشنا اے دل
اُس انجمن میں نہ کر عرضِ مدعا اے دل

خیال تجھ سے زیادہ اُسے عدو کا ہے
وہ بے وفا ہے اسے اب نہ منہ لگا اے دل

دیئے ہیں داغ بہت اس کی دوستی نے تجھے
اب اور دشمن جاں کو نہ آزما اے دل

جو اُس سے دور ہیں وہ بھی ہیں آج تک زندہ
سمجھ نہ اس بُتِ کافر کو تو خدا اے دل

اُسے رہی ہے سدا اپنی مصلحت درپیش
اُسے کسی کے زیاں کا ملال کیا اے دل

ہمارے ساتھ رہے ہیں جو بازوؤں کی طرح
نہ ہو سکیں گے کبھی ان سے ہم جدا اے دل

ہر اک دور میں ہم ظلم کے خلاف رہے
یہی ہے جُرم ہمارا یہی خطا اے دل
زمانہ آج نہیں معترف تو کل ہوگا
ہر ابتلا میں تو ثابت قدم رہا اے دل
وطن کے چاہنے والے سمجھ رہے ہوں گے
ہے کس خلوص سے جالبؔ غزل سرا اے دل

صدر امریکہ نہ جا

ایک ہی نعرہ ہے سب کا' ایک ہی سب کی صدا
صدر امریکہ نہ جا' اے صدر امریکہ نہ جا

سودا بازوں' سودخواروں سے ہماری دوستی
کِس قدر توہین ہے یہ لفظِ پاکستان کی

موت سے بدتر ہے ہم کو بھیک کی یہ زندگی
پاؤں پر اپنے کھڑا ہو وقت ہے پیارے یہی

جانسن کی اب نہ سُن اے جان اپنا کر بھلا
صدر امریکہ نہ جا اے صدر امریکہ نہ جا

ظلمت کو ضیا صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو. گہر، دیوار کو در، کرگس کو ہُما کیا لکھنا
اک حشر بپا ہے گھر گھر میں دم گھٹتا ہے گنبد بے در ہیں
اک شخص کے ہاتھوں مدت سے رسوا ہے وطن دنیا بھر میں
اے دیدہ ورو اس ذلت کو قسمت کا لکھا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

یہ اہلِ حشم، یہ دارا و جسم سب نقش بر آب ہیں اے ہمدم
مٹ جائیں گے سب پروردۂ شب اے اہلِ وفا رہ جائیں گے ہم
ہو جاں کا زیاں پر قاتل کو معصوم ادا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صر صر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا

لوگوں پہ ہی ہم نے جاں واری کی ہم نے انہی کی غمخواری
ہوتے ہیں تو ہوں یہ ہاتھ قلم شاعر نہ بنیں گے درباری
ابلیس نما انسانوں کی اے دوست ثنا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صر صر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا

حق بات پہ کوڑے اور زنداں، باطل کے شکنجے میں ہے یہ جاں
انساں ہیں کہ سہمے بیٹھے ہیں خونخوار درندے ہیں رقصاں
اس ظلم و ستم کو لطف و کرم اس دکھ کو دوا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صرصر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا

ہر شام یہاں شامِ ویراں آسیب زدہ رستے گلیاں
جس شہر کی دھن میں نکلے تھے وہ شہرِ دلِ برباد کہاں
صحرا کو چمن بن کر گلشن، بادل کو رِدا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صرصر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا

اے میرے وطن کے فنکارو ظلمت پہ نہ اپنا فن وارو
یہ محل سراؤں کے باسی قاتل ہیں سبھی اپنے یارو
ورثے میں ہمیں یہ غم ہے ملا اس غم کو نیا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صرصر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا

میں خوش نصیب شاعر

ہر دور کے بھکاری شاعر ادیب سارے
بکتے قدم قدم پہ دیکھے خطیب سارے
بیچا نہیں ہے میں نے اپنا ضمیر جالبؔ
میں خوش نصیب شاعر اور بدنصیب سارے

آدم جی ایوارڈ

سینۂ انساں کا یارو
زخم سلے اب یا نہ سلے
اپنی تو بس دوڑ ہے یہ
آدم جی ایوارڈ ملے

صحافی سے

اب شعر وہی ہے اے جالبؔ جس پر کوئی افسر جھوم اُٹھے
کر ایسی غزل سے بسم اللہ دفتر کا دفتر جھوم اُٹھے
جینا ہے اگر اس بستی میں اے دوست قصیدہ خواں ہو جا
اخبار میں لکھ ایسی باتیں صاحب کا سکتر جھوم اُٹھے

رائٹرز گلڈ

ذہانت رو رہی ہے منہ چھپائے
جہالت قہقہے برسا رہی ہے
ادب پر افسروں کا ہے تسلط
حکومت شاعری فرما رہی ہے

ادیبوں کے نام

کج فہم و کج کلاہ ادیبوں کو دیکھئے
بستی اجڑ چکے گی تو لکھیں گے مرثئے

تم نے تو یہ کہا تھا اجالا کریں گے ہم
تم نے تو سب چراغ دلوں کے بجھا دیئے

کرتے ہیں یونہی دُور جہالت کی تیرگی
رکھنا تھا جن پہ ہاتھ وہی سر قلم کیئے

اپنوں سے اختلاف ہے غیروں سے جنگ ہے
ہو صورتِ عذاب ہر اک جان کے لئے

زنداں ہیں گام گام کٹہرے قدم قدم
تم ہی بتاؤ کوئی یہاں کس طرح جئے

جینے کی آرزو ہے تو مرنا پڑے گا اب
اشکوں سے اپنے زخم کوئی کب تلک سیئے

جس ہاتھ نے اجاڑ دیا میرا گلستاں
اُس ہاتھ کو خدا کے لئے اُٹھ کے روکیے

تم شر کے پاسبان ہو میں خیر کا نشان
جو چیز تم ہے ہو، وہی میں بھی ہوں پئے

ہو گا طلوع کوہ کے پیچھے سے آفتاب
شب مستقل رہے گی کبھی یہ نہ سوچئے

میں تو مایوس نہیں اہلِ وطن سے یارو
کوئی ڈرتا نہیں اب دارورسن سے یارو

پھول دامن پہ سجائے ہوئے پھرتے ہیں وہ لوگ
جن کو نسبت ہی نہ تھی کوئی چمن سے یارو

سینۂ قوم کے ناسور ہیں یہ پھول نہیں
خوف سا آنے لگا سرو و سمن سے یارو

ظلم کے سر پہ کبھی تاج نہیں رہ سکتا
یہ صدا آنے لگی کوہ و دمن سے یارو

منزلِ کیف و طرب اپنے قدم چومے گی
ہم گزر آئے ہیں ہر رنج و محن سے یارو

کتنے خاموش تھے چپ چاپ تھے رستے گلیاں
یہ زمین بول اٹھی میرے سخن سے یارو

ملک میں عام کریں اپنے قلم کی دولت
یہ گزارش ہے مری اہل سخن سے یارو

مادرِ ملت

ایک آواز سے ایوان لرز اُٹھے ہیں
لوگ جاتے ہیں تو سلطان لرز اُٹھے ہیں

آمدِ صبحِ بہاراں کی خبر سنتے ہی
ظلمتِ شب کے نگہبان لرز اُٹھے ہیں

دیکھ کے لہر مرے دیس میں آزادی کی
قصرِ افرنگ کے دربان لرز اُٹھے ہیں

مشعلیں لے کے نکل آئے ہیں مظلوم عوام
غم و اندوہ میں ڈوبی ہے محلّات کی شام

یاس کا دور گیا خوف کی زنجیر کٹی
آج سہمے ہوئے لوگوں کو ملا اذنِ کلام

راہ میں لاکھ صداقت کے مخالف آئے
قوم نے سُن ہی لیا مادرِ ملّت کا پیام

ماں کے قدموں ہی میں جنّت ہے ادھر آجاؤ
ایک بے لوث محبت ہے ادھر آجاؤ

وہ پھر آئی ہیں ہمیں ملک دلانے کے لئے
ان کی یہ ہم پر عنایت ہے ادھر آجاؤ

اُس طرف ظلم ہے بیداد ہے حق تلفی ہے
اِس طرف پیار ہے الفت ہے ادھر آجاؤ

ماں

بچوں پہ چلی گولی
ماں دیکھ کے یہ بولی
یہ دل کے مِرے ٹکڑے
یوں روئیں مِرے ہوتے
میں دُور کھڑی دیکھوں
یہ مجھ سے نہیں ہوگا

میں دُور کھڑی دیکھوں
اور اہلِ ستم کھیلیں
خوں سے مِرے بچوں کے
دن رات یہاں ہولی
بچوں پہ چلی گولی
ماں دیکھ کے یہ بولی

یہ دل کے مِرے ٹکڑے
یوں روئیں مِرے ہوتے
میں دُور کھڑی دیکھوں
یہ مجھ سے نہیں ہوگا

میداں میں نکل آئی
اک برق سی لہرائی
ہر دستِ ستم کانپا
بندوق بھی تھرائی
ہر سمت صدا گونجی
میں آتی ہوں' میں آئی
میں آتی ہوں' میں آئی

ہر ظلم ہوا باطل
اور سہم گئے قاتل
جب اس نے زباں کھولی
بچوں پہ چلی گولی

اس نے کہا خونخوارو!
دولت کے پرستارو
دھرتی ہے یہ ہم سب کی
اس دھرتی کو نادانو!
انگریز کے دربانو!
صاحب کی عطا کردہ

جاگیر نہ تم جانو
اس ظلم سے باز آؤ
بیرک میں چلے جاؤ
کیوں چند لٹیروں کی
پھرتے ہو لئے ٹولی
بچوں پہ چلی گولی

گھر کے زنداں سے اسے فرصت ملے تو آئے بھی
جاں فزا باتوں سے آ کے میرا دل بہلائے بھی

لگ کے زنداں کی سلاخوں سے مجھے وہ دیکھ لے
کوئی یہ پیغام میرا اس تلک پہنچائے بھی

ایک چہرے کو ترستی ہیں نگاہیں صبح و شام
ضو فشاں خورشید بھی ہے چاندنی کے سائے بھی

سسکیاں لیتی ہوائیں پھر رہی ہیں دیر سے
آنسوؤں کی رُت مرے اب گلستاں سے جائے بھی

روز ہنستا ہے صلیبوں سے ادھر ماہِ منیر
اس کے پیچھے کون ہے وہ چھَب مجھے دکھلائے بھی

14 اگست

کہاں ٹوٹی ہیں زنجیریں ہماری
کہاں بدلی ہیں تقریریں ہماری

وطن تھا ذہن میں زنداں نہیں تھا
چمن خوابوں کا یوں ویراں نہیں تھا

بہاروں نے دیئے وہ داغ ہم کو
نظر آتا ہے مقتل باغ ہم کو

گھروں کو چھوڑ کر جب ہم چلے تھے
ہمارے دل میں کیا کیا ولولے تھے

یہ سوچا تھا ہمارا راج ہوگا
سرِ محنت کشاں پر تاج ہوگا

نہ لُوٹے گا کوئی محنت کِسی کی
ملے گی سب کو دولت زندگی کی

نہ چاٹیں گی ہمارا خوں مشینیں
بنیں گی رشکِ جنت یہ زمینیں

کوئی گوہر کوئی آدم نہ ہو گا
کِسی کو رہزنوں کا غم نہ ہو گا

لُٹی ہر گام پر اُمیدؔ اپنی
محرّم بن گئی ہر عید اپنی

مسلّط ہے سروں پر رات اب تک
وہی ہے صورتِ حالات اب تک

خوشی ہے چند لوگوں کی وراثت
کہا جاتا ہے غم ہیں اپنی قسمت

ہوئے ہیں جھونپڑے ہی نذرِ طوفاں
مگر قائم ہیں اب تک قصر و ایواں

خدایا کوئی آندھی اس طرف بھی
الٹ دے ان کلُہداروں کی صف بھی

زمانے کو جلال اپنا دکھا دے
جلا دے تخت و تاج ان کے جلا دے

ہے اب تک پابجولاں خطۂ پاک
پڑی آزادیوں کے سر پہ ہے خاک

ستارہ اوج پر ہے، رہزنوں کا
نہیں پرساں کوئی خستہ تنوں کا

○

نہیں وقعت کسی اہلِ نظر کی
عبادت ہو رہی ہے سیم و زر کی

خوشامد کا صلہ تمغائے خدمت
خوشامد سے ملے سفلوں کو عزّت

خوشامد جو کرے فن کار ہے وہ
جو سچ بولے یہاں غدّار ہے وہ

○

لبِ اہلِ قلم پر ہیں قصیدے
دکاں ٹکیائی کی ہیں یا جریدے

ثناء بندوں کی ہم سنتے ہیں اکثر
خدا سے بھی زیادہ ریڈیو پر

ادیب و شاعر و ملّا و رہبر
سبھی کچھ ہوگیا ڈپٹی کمشنر

ادیبوں کو ہے آدم جی نے گھیرا
چٹانوں پر کہاں ان کا بسیرا

ادب میں اب کہاں دل کا اجالا
ادیبوں نے قلم کو بیچ ڈالا

○

ہیں باہر بائیاں سازندے اندر
یہ سب غنڈوں کے ہیں کارندے اندر

ابھی غنڈے تو ہیں محلوں میں آباد
کریں گے ہم وطن کو ان سے آزاد

کریں گے ضبط ہم جاگیر ان کی
نہ چلنے دیں گے ہم تدبیر ان کی

یہ دولت کی ہوس، جاگیرداری
ہیں دونوں لعنتیں دشمن ہماری

یہ دونوں لعنتیں جب تک رہیں گی
جہاں میں ندّیاں خوں کی بہیں گی

بہتے لہو میں سب ترا مفہوم بہہ گیا
14 اگست صرف ترا نام رہ گیا

جلنا ہے غم کی آگ میں، ہم کو تمام شب
بجھتا ہوا چراغ سرِ شام کہہ گیا

ہوتا اگر پہاڑ تو لاتا نہ تابِ غم
جو رنج اس نگر میں یہ دل ہنس کے سہہ گیا

گزرے ہیں اس دیار میں یوں اپنے روز و شب
خورشید بجھ گیا کبھی مہتاب گہہ گیا

مجھ سے خفیف ہیں مرے ہم عصر اس لئے
میں داستانِ عہدِ ستم کھل کے کہہ گیا

شاعر حضورِ شاہ سبھی سر کے بل گئے
جالبؔ ہی اس گناہ سے بس دور رہ گیا

عورت

بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا
دیوار ہے وہ اب تک جس میں تجھے چُنوایا

دیوار کو آتوڑیں، بازار کو آ ڈھائیں
انصاف کی خاطر ہم سڑکوں پر نکل آئیں
مجبور کے سر پر ہے شاہی کا وہی سایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

تقدیر کے قدموں پر سر رکھ کے پڑے رہنا
تائیدِ ستم گر ہے چپ رہ کے ستم سہنا

حق جس نے نہیں چھینا حق اُس نے کہاں پایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

کُٹیا میں تیرا پیچھا غربت نے نہیں چھوڑا
اور محل سرا میں بھی زردار نے دل توڑا
اُف تجھ پہ زمانے نے کیا کیا نہ ستم ڈھایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

تُو آگ میں اے عورت زندہ بھی جلی برسوں
سانچے میں ہر اک غم کے چپ چاپ ڈھلی برسوں
تجھ کو کبھی جلوایا تجھ کو کبھی گڑوایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

نیلو

تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
تجھ کو انکار کی جرأت جو ہوئی تو کیونکر
سایہ شاہ میں اس طرح جیا جاتا ہے؟

اہل ثروت کی یہ تجویز ہے سرکش لڑکی
تجھ کو دربار میں کوڑوں سے نچایا جائے
ناچتے ناچتے ہوجائے جو پائل خاموش
پھر نہ تازیست تجھے ہوش میں لایا جائے

لوگ اس منظرِ جانکاہ کو جب دیکھیں گے
اور بڑھ جائے گا کچھ سطوتِ شاہی کا جلال

تیرے انجام سے ہر شخص کو عبرت ہوگی
سر اٹھانے کا رعایا کو نہ آئے گا خیال

طبعِ شاہانہ پہ جو لوگ گراں ہوتے ہیں
ہاں اُنہیں زہر بھرا جام دیا جاتا ہے

تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

○

مشکلیں دنیا میں اوروں کی تو آساں ہو گئیں
بند کمروں میں سلگتے ہم کو صدیاں ہو گئیں

اپنے پہلو میں لئے پھرتے ہیں دل کی لاش کو
زندگی کی حسرتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں

اب بھی شرمندہ نہیں ہیں لوگ اپنی سوچ پر
شہر اجڑے بستیاں کتنی ہی ویراں ہو گئیں

ترانہ

اب دہر میں بے یارومددگار نہیں ہم
پہلے کی طرح بے کس و لاچار نہیں ہم

آتا ہے ہمیں اپنے مقدّر کو بنانا
تقدیر پہ شاکر پسِ دیوار نہیں ہم

تم ظلم کیے جاؤ خدا ہی رہو اپنے
ساتھی ہیں برابر کے پرستار نہیں ہم

سب جور و ستم لطف و کرم پیشِ نظر ہیں
یہ وہم تمہارا ہے کہ بیدار نہیں ہم

کیوں دست نگر ہو کے جبیں بر سرِ عالم
ذی عقل ہیں ذی علم ہیں بیمار نہیں ہم

ایمان خدا پر ہے محمدؐ پہ یقیں ہے
لیکن یہ بجا واقفِ اسرار نہیں ہم

اے جہاں دیکھ لے!

اے جہاں دیکھ لے کب سے بے گھر ہیں ہم
اب نکل آئے ہیں لے کے اپنا علم
یہ محلّات یہ اونچے اونچے مکاں
ان کی بنیاد میں ہے ہمارا لہو
کل جو مہمان تھے گھر کے مالک بنے
شاہ بھی ہے عدو، شیخ بھی ہے عدو
کب تلک ہم سہیں غاصبوں کے ستم
اے جہاں دیکھ لے کب سے بے گھر ہیں ہم
اب نکل آئے ہیں لے کے اپنا علم

اتنا سادہ نہ بن تجھ کو معلوم ہے
کون گھیرے ہوئے ہے فلسطین کو

آج کھُل کے یہ نعرہ لگا اے جہاں
قاتلو، رہزنو، یہ زمیں چھوڑ دو
ہم کو لڑنا ہے جب تک کہ دم میں ہے دم
اے جہاں دیکھ لے کب سے بے گھر ہیں ہم
اب نکل آئے ہیں لے کے اپنا علم

فلسطین

روشنیوں کی راہ میں جو دیوار بنے گا
نہیں رہے گا
غاصب کو غاصب جو کھل کر نہیں کہے گا
نہیں رہے گا
شاہی ہے صدیوں کی سیاہی چھٹ جائے گی
کٹ جائے گی درد کی منزل کٹ جائے گی
جو خونخوار لٹیروں کے ہمراہ چلے گا
نہیں رہے گا
گرتی ہوئی دیوار سے ناطہ توڑو بھی
خوش فہمو! اب سامراج کو چھوڑو بھی
وقت کی جو آواز کو اب بھی نہیں سنے گا
نہیں رہے گا

غاصبوں کے ساتھیو!

یہ جو لمحہ جا رہا ہے

چھوڑتا جاتا ہے تم کو کتنا پیچھے بے حسو!
اور بزعم خود بہت ایماندار و بزدلو!
امن و ایماں سے ہیں بڑھ کر تم کو اپنے تخت و تاج
غاصبوں کے ساتھیو' او قاتلوں کے دوستو!

یہ سمجھ میں آچکا ہے

امن اور انسانیت کے تم بھی ہو دشمن تمام
فتح یاسر اصل میں ہے مرگ کا تم کو پیام
اپنے آقاؤں کے آگے کس طرح آنکھیں اٹھاؤ
زندگی سے ہے انہی کی بادشاہت کا نظام

تم بھی ہو گھیراؤ میں اب

تم کو بھی ہونا ہے غارت غاصبوں کے ساتھ ساتھ
چاہتے ہو زندگی تو مان لو لوگوں کی بات
فتح ہے جس کا مقدر آؤ اس لشکر میں آؤ
آؤ انسانوں کی جانب مت بنو شیطاں صفات

جہاں خطرے میں ہے اسلام اس میدان میں جاؤ
ہماری جان کے درپے ہو کیوں لبنان میں جاؤ
دھواں ہے خون ہے، چیخیں ہیں اور لاشیں ہی لاشیں ہیں
ستم کی آندھیوں میں ظلم کے طوفان میں جاؤ
کنارے سے کہاں ہوتا ہے اندازہ تلاطم کا
ذرا موجوں سے ٹکراؤ ذرا طغیان میں جاؤ
فقط تشویش ہی سے ظلم کا سر جھک نہیں سکتا
یہاں جولانیاں کیا خطۂ جولان میں جاؤ
کیئے ہیں غاصبوں نے ظلم وہ اہلِ فلسطیں پر
قیامت کا سماں ہے خانۂ جبران میں جاؤ
اجازت مانگتے ہیں ہم بھی جب بیروت جانے کی
تو اہل الحکم فرماتے ہیں تم زندان میں جاؤ

برق پاشی

نظر جائے تو کیونکر سامیوں کی بدمعاشی پر
توجہ ان دنوں ہے شیخ صاحب کی فحاشی پر
سلگتے ہیں نشیمن اور خوں شاخوں سے بہتا ہے
مشوّش ہیں فقط وہ اس بلا کی برق پاشی پر

اے لوگو!

شیوخ و شاہ بھی کب ہیں ہمارے یار اے لوگو!
ہمارا خون پیتے ہیں یہ سب مکّار اے لوگو!
یہ تخت و تاج والے غاصبوں ہی کے مصاحب ہیں
ہمارے راستے کی یہ بھی ہیں دیوار اے لوگو!

خدایا یہ مظالم بے گھروں پر

خدایا یہ مظالم بے گھروں پر
کوئی بجلی گرا فتنہ گروں پر

یہ اے اہلِ جور یہ ظالم لٹیرے
مسلط جانے کب سے ہیں سروں پر

یہ خوں بچّوں کا اور ماؤں کا خوں ہے
پڑا ہے جو سروں کی چادروں پر

خوش و خُرّم شہ و شہزادگاں ہیں
ہر آفت ٹوٹتی ہے بے بے زروں پر

ثنا خواں اب بھی ہیں جو قاتلوں کے
خدایا رحم ان دانشوروں پر

لبنان چلو، لبنان چلو

شیطان جہاں ہے برق فشاں
انسان جہاں ہے نوحہ کُناں
خطرے میں جہاں ہے امنِ جہاں
کہتا ہے وہیں ایمان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

کشتی کو بچانے طوفاں سے
انساں کو چھڑانے شیطاں سے
بیگن کو بھگانے میداں سے
کہتا ہے دل ہر آن چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

اے اہلِ عرب اے اہلِ عجم
کرنا ہے تکبّر کا سر خم
غاصب کو مٹا کر لینا ہے دم
پیارو ہو کر یک جان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

قاتل سے کہاں جاں چھوٹی ہے
ہر دل پہ قیامت ٹوٹی ہے
خونخوار عدو نے لوٹی ہے

بچوں کی جہاں مُسکان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

یاسر کے بہادر جیالوں پر
ظلمت کے مٹانے والوں پر
خورشیدِ سحر کے اجالوں پر
ہونے کے لئے قربان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

دم اہلِ جنوں کا بھرنے کو
جاں حق پہ نچھاور کرنے کو
رستے میں وفا کے مرنے کو
سر لے کر سرِ میدان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

یہ جنگ ہے امنِ عالم کی
یہ جنگ ہے ہر اہلِ غم کی
یہ جنگ ہے نسلِ آدم کی
انساں کی بڑھانے شان چلو
لبنان چلو، لبنان چلو

ریگن

ہر غاصب کے سر پر ہاتھ ہے ریگن کا
رہبر ہے یہ دنیا کے ہر رہزن کا
اسرائیل کی پُشت پہ بھی ہے ہاتھ یہی
بانٹتا پھرتا ہے جنگی آلات یہی
سُکھ لُوٹا ہے اس نے آنگن آنگن کا
ہر غاصب کے سر پر ہاتھ ہے ریگن کا

روشنیوں سے لڑنا اس کی عادت ہے
ظلم سے اس کو پیار ہے' پیار سے نفرت ہے
اس کو کھیل پسند ہے آتش و آہن کا
ہر غاصب کے سر پر ہاتھ ہے ریگن کا

ہوش کا دامن کب تک چھوڑے رکھو گے
موت سے کب تک ناطہ جوڑے رکھو گے
آؤ دکھاؤں تم کو رستہ جیون کا
رہبر ہے یہ دنیا کے ہر رہزن کا
ہر غاصب کے سر پر ہاتھ ہے ریگن کا

یزید سے ہیں نبرد آزما فلسطینی

یزید سے ہیں نبرد آزما فلسطینی
اٹھائے ہاتھوں میں اپنے حسینیت کا علم
ادیبو، شاعرو، دانشورو، سُخن دانو
کرو حکایتِ بیروت خونِ دل سے رقم
شکست جہل کو ہوگی شعور جیتے گا
کرے گا جہل کہاں تک سرِ شعور قلم

○

چلی ہے وہ ہوائے زہرِ آگیں
کہ بجھ کر رہ گئی ہے شمعِ تمکیں
دُعا گویانِ عالم کو خبر کیا
کہ کس عالم میں ہیں اہلِ فلسطیں

ہوا لبنان میں وہ حشر برپا
زمیں خونِ شہیداں سے ہے رنگیں

○

شیوخ و شاہ کو سمجھو نہ پاسبانِ حرم
یہ بندگانِ زر و سیم ہیں خدا کی قسم
شیوخ و شاہ تو ہیں خود شریکِ ظلم و ستم
شیوخ و شاہ سے رکھو نہ کچھ اُمیدِ کرم
امیر کیسے نہ واشنگٹن کے ساتھ رہیں
انہی کے دم سے ہیں ساری امارتیں ہمدم
یہ مانگتے ہیں دعائیں برائے اسرائیل
کہ اسرائیل سے ہیں بادشاہتیں قائم
غرض انہیں تو فقط اپنے تخت و تاج سے ہے
انہیں شہید فلسطینیوں کا کیوں ہو غم

گماشتے ہیں یہ سب سامراج کے [illegible]

1971ء کے خوش آشام بنگال کے نام

محبّت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

(مشرقی پاکستان میں فوج کشی کے موقع پر)

لوگو

آخری رات ہے یہ سر نہ جُھکانا لوگو
حُسنِ ادراک کی شمعیں نہ بجھانا لوگو
اِنتہاءِ ظلم کی ہوجائے وفا والوں پر
غیر ممکن ہے محبت کو مٹانا لوگو

وہ کہہ رہے ہیں محبت نہیں وطن سے مجھے
سکھا رہے ہیں محبت مشین گن سے مجھے
میں بے شعور ہوں، کہتا نہیں ستم کو کرم
یہی خطاب ملا ان کی انجمن سے مجھے

جُھکے گا ظلم کا پرچم یقیں آج بھی ہے
مرے خیال کی دنیا حسین آج بھی ہے

بہت ہوائیں چلیں میرا رُخ بدلنے کو
مگر نگاہ میں وہ سر زمین آج بھی ہے

صعوبتوں کے سفر میں ہے کاروان حُسین
یزید چَین سے مسند نشین آج بھی ہے

بگیا لہولہان

ہریالی کو آنکھیں ترسیں بگیا لہولہان
پیار کے گیت سُناؤں کس کو شہر ہوئے ویران
بگیا لہولہان
ڈستی ہیں سورج کی کرنیں چاند جلائے جان
پگ پگ موت کے گہرے سائے جیون موت سمان
چاروں اور ہوا پھرتی ہے لے کر تیر کمان
بگیا لہولہان
چھلنی ہیں کلیوں کے سینے خون میں لت پت پات
اور نہ جانے کب تک ہوگی اشکوں کی برسات
دُنیا والو کب بیتیں گے دُکھ کے یہ دن رات
خون سے ہولی کھیل رہے ہیں دھرتی کے بلوان
بگیا لہولہان

داستانِ دلِ دونیم

اک حسیں گاؤں تھا کنارِ آب
کتنا شاداب تھا دیارِ آب

کیا عجب بے نیاز بستی تھی
مفلسی میں بھی ایک مستی تھی

کتنے دلدار تھے ہمارے دوست
وہ بچارے وہ بے سہارے دوست

اپنا اک دائرہ تھا' دھرتی تھی
زندگی چین سے گزرتی تھی

قصہ جب یوسف و زلیخا کا
میٹھے سروں میں چھِڑتا تھا

قصر شاہوں کے ہلنے لگتے تھے
چاک سینوں کے سلنے لگتے تھے

گیت سُنتے تھے گیت گاتے تھے
ڈوب کر سُر میں دن بِتاتے تھے

یوں بھڑک اٹھی نفرتوں کی آگ
زندگی میں رہے وہ رنگ نہ راگ

دیکھنے کیا لگے سہانے خواب
ہوگئے اپنے آشیانے خواب

یہ بجا زیست پاپیادہ تھی
دھوپ سے چھاؤں تو زیادہ تھی

شاخ سے ٹوٹ کر ہوا کے ہوئے
در بدر اُس گلی سے آکے ہوئے

اجنبی لوگ، اجنبی راہیں
لب پہ آباد ہوگئیں آہیں

ہوئے آقا فرنگیوں کے غُلام
شبِ آلام ہو سکی نہ تمام

ہوگئے حکمراں کمینے لوگ
خاک میں مل گئے نگینے لوگ

ہر محبِّ وطن ذلیل ہوا
رات کا فاصلہ طویل ہوا

بے حیائی کو جس نے اپنایا
وہی عِزّت ماب کہلایا

آمروں کے جو گیت گاتے رہے
وہی انعام و داد پاتے رہے

رہزنوں نے جو رہزنی کی تھی
رہبروں نے بھی کیا کمی کی تھی

ایک بار اور ہم ہوئے تقسیم
ایک بار اور دل ہوا دونیم

ہو گئے دور راہبر کیا کیا
چھن گئے ہائے ہم سفر کیا کیا

یہ فسانہ ہے پاسبانوں کا
چاق و چوبند نوجوانوں کا

سرحدوں کی نہ پاسبانی کی
ہم سے ہی داد لی جوانی کی

اس زمانے کی کیا لکھوں رُوداد
خوف، مہنگائی، جبر و استبداد

اب کمشنر زکوٰۃ دیتے ہیں
اور ٹی، وی پہ داد لیتے ہیں

بھیک سے ملک بھی چلے ہیں کبھی
زندہ قوموں کا یہ شعار نہیں

اک نظر اپنی زندگی پر ڈال
اک نظر اپنے اردلی پر ڈال

فاصلہ خود ہی کر ذرا محسوس
یوں نہ اسلام کا نکال جلوس

یہ زمیں تو حسین ہے بے حد
حکمرانوں کی نیتیں ہیں بد

حکمراں جب تلک ہیں یہ بے درد
اس زمیں کا رہے گا چہرہ زرد

یہ زمیں جب تلک نہ لیں گے ہم
اس سے اُگتے رہیں گے یونہی غم

بے گھری کو کریں گے ہم ہی دُور
ہم ہی دیں گے دلوں کو پیار کا نور

خلق صدیوں کے ظلم کی ماری
یوں نہ حیراں پھرے گی بے چاری

روٹی، کپڑا، مکان ہم دیں گے
اہلِ محنت کو شان ہم دیں گے

اس خزاں کو مٹائیں گے ہم ہی
فصلِ گل لے کے آئیں گے ہم ہی

گوشے میں قفس کے......

بہت سے دکھ سہے ہیں اور سہہ جا
یہ فرصت پھر کہاں، کچھ شعر کہہ جا
وفا کی راہ میں خود کو مِٹا کے
زمانے کو ہمیشہ یاد رہ جا
بہت مشکل مری پہچان ہوگی
بدل ڈالوں اگر میں اپنا لہجا

○

دل کی کچھ پروا نہیں زخمِ جگر کا غم نہیں
غم اگر ہے تو وطن کا، ہم کو گھر کا غم نہیں
اس جہادِ زندگی میں ہم تو سمجھے ہیں یہی
وہ بشر ہی کیا جسے نوعِ بشر کا غم نہیں

○

گناہِ عشق پہ کیونکر نہ ہو یہ دل نازاں
لگا رہا ہے کنارے ہمیں یہی طوفاں
اب اور جاکے کہیں اپنا سر کھپا ناصح
یہی نا، کوچہ محبوب میں ہے جاں کا زیاں

خدا ہمارا ہے

خدا تمہارا نہیں ہے خدا ہمارا ہے
اُسے زمین پہ یہ ظلم کب گوارا ہے

لہو پیو گے کہاں تک ہمارا دھنوانو
بڑھاؤ اپنی دکاں سیم و زر کے دیوانو
نشاں کہیں نہ رہے گا تمہارا شیطانو
ہمیں یقیں ہے کہ انسان اس کو پیارا ہے
خدا تمہارا نہیں ہے خدا ہمارا ہے
اُسے زمین پہ یہ ظلم کب گوارا ہے

نئے شعور کی ہے روشنی نگاہوں میں
اک آگ سی بھی ہے اب اپنی سرد آہوں میں
کھلیں گے پھول نظر کے سحر کی بانہوں میں
دکھے دلوں کو اسی آس کا سہارا ہے
خدا تمہارا نہیں ہے، خدا ہمارا ہے
اُسے زمین پہ یہ ظلم کب گوارا ہے

طلسمِ سایۂ خوف و ہراس توڑیں گے
قدم بڑھائیں گے زنجیرِ یاس توڑیں گے
کبھی کسی کے نہ ہم دل کی آس توڑیں گے
رہے گا یاد جو عہدِ ستم گزارا ہے
اُسے زمین پہ یہ ظلم کب گوارا ہے

کیا یہ کس نے تقاضا ہمیں شراب ملے
ہر اک فراق گوارا مگر کتاب ملے

یہ سوچ کر نہ کبھی ہم نے عرضِ حال کیا'
کہ اُس طرف سے ہمیں جانے کیا جواب ملے

نہ کوہ پر اُنہیں دیکھا نہ دشت میں پایا
عدالتوں ہی میں عشّاقِ انقلاب ملے

ہمارے سامنے اُبھرے اُبھر کے ڈوب گئے
اُفق پہ ایسے بھی کچھ ہم کو آفتاب ملے

بہار آئی مگر ہم کو یہ رہی حسرت
کسی روش پہ مہکتا کوئی گلاب ملے

مٹے جو راہِ وطن میں پڑے ہیں زنداں میں
وہ حکمراں ہیں سروں کے جنہیں خطاب ملے

اسیر رنج و محن اک ہمیں نہ تھے جالبؔ
قفس میں اور بہت خانماں خراب ملے

اپنے بچوں کے نام

میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صُورت
دکھ میں ڈوبے ہوئے دن رات گزر جائیں گے
کوئی تحقیر کی نظروں سے نہ دیکھے گا ہمیں
پیار کے رنگ ہر اک سمت بکھر جائیں گے
پیار اُگائے گی نگاہوں کو سکوں بخشے گی
یہ زمیں خُلدِ بریں کی صُورت
میں ضرور آؤں گا اک عہد حسین کی صُورت

ایسے الفاظ نہ اوراق لغت میں ہوں گے
جن سے انسان کی توہین کا پہلو نکلے
ایسے افکار بھی زندہ نہ رہیں گے جن سے
چند لوگوں ہی کی تسکین کا پہلو نکلے

خوں نہ روئے گا کبھی درد کی تنہائی میں
دل کسی خاک نشیں کی صُورت
میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صُورت

کسی لہجے سے نہ مجروح سماعت ہوگی
جہل کے ناز اُٹھانے نہ پڑیں گے ہم کو
یاس انگیز اندھیرا نہ کبھی چھائے گا
آس کے دیپ بجھانے نہ پڑیں گے ہم کو
غم کے ماروں کی ہر اک شام چمک اٹھے گی
صبح فرخندہ جبیں کی صُورت
میں ضرور آؤں گا اک عہدِ حسیں کی صُورت

لتا

تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیتے ہیں دِن رَین ہمارے
تیری اگر آواز نہ ہوتی
بجھ جاتی جیون کی جوتی
تیرے سچّے سُر ہیں ایسے
جیسے سورج، چاند، ستارے
تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیتے ہیں دن رین ہمارے
کیا کیا تونے گیت ہیں گائے
سُر جب لاگے من جُھک جائے

تجھ کو سُن کر جی اُٹھتے ہیں
ہم جیسے دکھ درد کے مارے
تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیتے ہیں دن رین ہمارے
میرا تجھ میں آن بسی ہے
انگ وہی ہے رنگ وہی ہے
جگ میں تیرے داس ہیں اتنے
جتنے ہیں آکاش پہ تارے
تیرے مدھر گیتوں کے سہارے
بیتے ہیں دن رین ہمارے

(حیدر آباد جیل میں لکھی گئی)

○

تیری بھیگی ہوئی آنکھیں ہیں مجھے یاد اب تک
تو اسی طرح خیالوں میں ہے آباد اب تک

تو مرے ساتھ ہمیشہ رہی دھڑکن دھڑکن
تجھ کو بھولا نہیں اے جاں دلِ ناشاد اب تک

آنسوؤں پر وہی پہرے ہیں ستم گاروں کے
وہی ہونٹوں پہ ہے سہمی ہوئی فریاد اب تک

اپنا افسانۂ غم کس کو سناتے جالبؔ
ہم تو سنتے رہے اوروں ہی روداد اب تک

○

چُور تھا زخموں سے دل، زخمی جگر بھی ہو گیا
اُس کو روتے تھے کہ سُونا یہ نگر بھی ہو گیا

لوگ اسی صورت پریشاں ہیں جدھر بھی دیکھئے
اور وہ کہتے ہیں کوہِ غم تو سر بھی ہو گیا

بام و در پر ہے مسلط آج بھی شامِ الم
یوں تو ان گلیوں سے خورشیدِ سحر بھی ہو گیا

اُس ستمگر کی حقیقت ہم پہ ظاہر ہو گئی
ختم خوش فہمی کی منزل کا سفر بھی ہو گیا

میری بچّی

میری بچّی میں آؤں نہ آؤں
آنے والا زمانہ ہے تیرا
تیرے ننھے سے دل کو دکھوں نے
میں نے مانا کہ ہے آج گھیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

تیری آشا کی بگیا کھِلے گی
چاند کی تجھ کو گڑیا ملے گی
تیری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے
ختم ہو گا سِتم کا اندھیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

درد کی رات ہے کوئی دم کی
ٹوٹ جائے گی زنجیر غم کی
مسکرائے گی ہر آس تیری
لے کے آئے گا خوشیاں سویرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

سچ کی راہوں میں جو مر گئے ہیں
فاصلے مختصر کر گئے ہیں
دُکھ نہ جھیلیں گے ہم منہ چھپا کے
سُکھ نہ لوٹے گا کوئی لٹیرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا

○

کسی سے حالِ دلِ زار مت کہو سائیں
یہ وقت جیسے بھی گزرے گزار لو سائیں

وہ اس طرح سے ہیں بچھڑے کہ مل نہیں سکتے
وہ اب نہ آئیں گے ان کو صدا نہ دو سائیں

تمہیں پیام دیئے ہیں صبا کے ہاتھ بہت
تمہارے شہر میں ہیں تم جو آسکو سائیں

نہ مال و زر کی تمنا نہ جاہ و حشمت کی
ملیں گے پیار سے ہم ایسے لوگ تو سائیں

کہیں تو کس سے کہیں اور سنے تو کون سنے
گزر گئی ہے محبت میں ہم پہ جو سائیں

اکیلے جاگتے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا
تمام خواب میں ہیں تم بھی سو رہو سائیں

میری بانہوں میں رہے میری نگاہوں میں رہے
اِس سے پہلے اس قدر کب وہ خیالوں میں رہے

رفتگاں کو یاد کرنے کی بہت فرصت ملی
میری آنکھوں میں رہے وہ میرے اشکوں میں رہے

آشیاں سے بھی قفس کی زندگی اچھّی لگی
رات دن بچھڑے ہوئے احباب یادوں میں رہے

موت بھی ان کو جدا مجھ سے نہ جالبؔ کر سکی
میرے گیتوں میں رہے وہ میری غزلوں میں رہے

کہنے کی بات

شاعر بھی زنجیر بپا ہے گائک بھی آزاد نہیں
ہر دل پر ہیں خوف کے سائے کون ہے جو ناشاد نہیں

اُونچ نیچ کی گرد نہ پڑنے دو سوچوں کے دامن پر
یہی کہا تھا ہم نے یارو اور ہمیں کچھ یاد نہیں

جو کہنے کی بات تھی کہہ کر دار و رسن تک آئے ہیں
ہونٹوں پر ہے گیت وفا کا آہ نہیں فریاد نہیں

لاکھ دھڑکتا ہو پہلو میں پتھّر ہی کہلائے گا
انسانوں کے درد سے جو دل اے جالبؔ آباد نہیں

زندگی بھر ذہن و دل پر خوف کے سائے رہے
ہائے سچّائی کے کتنے پھول مرجھائے رہے

عمر اپنی کٹ گئی محرومیوں کی دھوپ میں
چند لوگوں کا مقدّر زلف کے سائے رہے

روشنی کے دشمنوں نے روشنی ہونے نہ دی
ایک مدّت تک خیال و فکر دھندلائے رہے

دوسروں کو روشنی دیتے رہے دن رات ہم
اپنے ارمانوں کے سورج چاند گہنائے رہے

آرہی ہے، آنے والی ہے محبت کی سحر
ہم یہی کہہ کے اپنے دل کو بہلائے رہے

کچھ لوگ خیالوں سے چلے جائیں تو سوئیں
بیتے ہوئے دن رات نہ یاد آئیں تو سوئیں

چہرے جو کبھی ہم کو دکھائی نہیں دیں گے
آ آ کے تصور میں نہ تڑپائیں تو سوئیں

برسات کی رُت کے وہ طرب ریز مناظر
سینے میں نہ اک آگ سی بھڑکائیں تو سوئیں

صبحوں کے مقدّر کو جگاتے ہوئے مکھڑے
آنچل جو نگاہوں میں نہ لہرائیں تو سوئیں

محسوس یہ ہوتا ہے ابھی جاگ رہے ہیں
لاہور کے سب یار بھی سو جائیں تو سوئیں

ننھی جا سو جا

جب دیکھو تو پاس کھڑی ہے ننھی جا سو جا
تجھے بلاتی ہے سپنوں کی نگری جا سو جا
غصے سے کیوں گھور رہی ہے میں آجاؤں گا
کہہ جو دیا ہے تیرے لئے اک گڑیا لاؤں گا
گئی نہ ضد کرنے کی عادت تیری جا سو جا
ننھی جا سو جا
ان کالے دروازوں سے مت لگ کر دیکھ مجھے
اُڑ جاتی ہے نیند آنکھوں سے پاکر پاس تجھے
مجھ کو بھی سونے دے میری پیاری جا سو جا
ننھی جا سو جا
کیوں اپنوں اور بیگانوں کے شکوے کرتی ہے
کیوں آنکھوں میں آنسو لاکر آہیں بھرتی ہے
رونے سے کب رات کٹی ہے دکھ کی جا سو جا
ننھی جا سو جا

اپنے بیٹے طاہر عباس کی یاد میں

آج وہ زندہ جو ہوتا' وہ بھی خط لکھتا مجھے
پڑھ کے نور افشاں کا خط وہ اور یاد آیا مجھے

یوں تو کیا پایا ہے اس جینے میں اشکوں کے سوا
زندگی بھر اس کا کھو جانا نہ بھُولے گا مجھے

پھول کو جب دیکھتا ہوں میری بھر آتی ہے آنکھ
لگ رہا ہے یہ جہاں صدیوں کا ویرانہ مجھے

جی بھی کیا سکتا تھا وہ اس سنگدِل ماحول میں
اب سمجھ آیا جہاں سے اس کا اُٹھ جانا مجھے

باتیں تو کچھ ایسی ہیں کہ خود سے بھی نہ کی جائیں
سوچا ہے خموشی سے ہر اک زہر کو پی جائیں

اپنا تو نہیں کوئی وہاں پوچھنے والا
اُس بزم میں جانا ہے جنہیں اب تو وہی جائیں

اب تجھ سے ہمیں کوئی تعلّق نہیں رکھنا
اچھا ہو کہ دل سے تری یادیں بھی چلی جائیں

اک عمر اُٹھائے ہیں سِتم غیر کے ہم نے
اپنوں کی تو اک پل بھی جفائیں نہ سہی جائیں

جالبؔ غمِ دوراں ہو کہ یادِ رُخِ جاناں
تنہا مجھے رہنے دیں مرے دل سے سبھی جائیں

صد شُکر

اہلِ سِتم کے حلقہ بگوشوں میں ہم نہیں
صد شکر اِن ضمیر فروشوں میں ہم نہیں

سچ ہی لکھتے جانا

دینا پڑے کچھ ہی ہرجانہ سچ ہی لکھتے جانا
مت گھبرانا مت ڈر جانا، سچ ہی لکھتے جانا

باطِل کی منہ زور ہوا سے جو نہ کبھی بجُھ پائیں
وہ شمعیں روشن کر جانا سچ ہی لکھتے جانا

پل دو پل کے عیش کی خاطر کیا دینا کیا جُھکنا
آخر سب کو ہے مرجانا سچ ہی لکھتے جانا

لوحِ جہاں پر نام تمہارا لکھا رہے گا یونہی
جالبؔ سچ کا دم بھرجانا سچ ہی لکھتے جانا

○

ذرّے ہی سہی کوہ سے ٹکرا تو گئے ہم
دل لے کے سرِ عرصۂ غم آتو گئے ہم

اب نام رہے یا نہ رہے عشق میں اپنا
رُودادِ وفا دار پہ دُہرا تو گئے ہم

کہتے تھے جو اب کوئی نہیں جاں سے گزرتا
لو جاں سے گزر کر انہیں جھٹلا تو گئے ہم

جاں اپنی گنوا کر کبھی گھر اپنا جلا کر
دل اُن کا ہر اک طور سے بہلا تو گئے ہم

کچھ اور ہی عالم تھا پسِ چہرۂ یاراں
رہتا جو یونہی راز اُسے پاتو گئے ہم

اب سوچ رہے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے
پھر ان سے نہ ملنے کی قسم کھا تو گئے ہم

اٹھیں کہ نہ اٹھیں یہ رضا ان کی ہے جالبؔ
لوگوں کو سرِدار نظر آ تو گئے ہم

شکوہ نہ کر

کیا ہے عِشق تو شِکوہ نہ کر زمانے کا
بیاں ہوا تو گیا حسن اس فسانے کا

سزا کے طور پہ ہم کو ملا قفس جالبؔ
بہت تھا شوق ہمیں آشیاں بنانے کا

شبِ الم کا سفر

کیا ہے صرف بہر گام خونِ قلب و جگر
بھلا سکے گی نہ ہم کو طلب کی راہ گزر

کہاں تمام ہوا ہے شبِ الم کا سفر
ابھی تو دور بہت دور ہے طلوعِ سحر

نہ اپنے لب پہ فغاں ہے نہ اپنی آنکھ ہی تر
ہمارے درد کی پھر بھی ہے اک جہاں کو خبر

اسے بجھا نہ سکے گی ہوا زمانے کی
جلا چکے ہیں لہو سے جو ہم چراغِ سحر

جگر کا خون ہوا دل بھی ہوگیا چھلنی
مگر ملال نہیں ہے ذرا بھی چہرے پر

ضرور ان کے قدم لیں گی منزلیں اک دن
کہ ایک عمر سے اہلِ جنوں میں محوِ سفر

وہی ہوئے ہیں سرافراز دہر میں اے دوست
کٹا گئے ہیں رہِ عشق میں جو اپنے سر

سلام دیس کے جمہوریت پسندوں کو
جو سب کے حق کے لئے لڑ رہے ہیں شام سحر

ق

ہیں انقلاب کے ذاکر بہت زمانے میں
حکایتیں نہ سُنا عیشِ گفتگو سے گزر

نظر اُٹھا کے جہاں کو بھی دیکھ لے جالبؔ
عمل کی سمت بھی آ شعر و شاعری ہی نہ کر

دنیا ہے کتنی ظالم ہنستی ہے دل دُکھا کے
پھر بھی نہیں بجھائے ہم نے دیئے وفا کے

ہم نے سلوکِ یاراں دیکھا جو دشمنوں سا
بھر آیا دل ہمارا روئے ہیں منہ چھپا کے

کیوں کر نہ ہم بٹھائیں پلکوں پہ ان غموں کو
شام و سحر یہی تو ملتے ہیں مسکرا کے

تا عمر اس ہنر سے اپنی نہ جان چھوٹی
کھاتے رہے ہیں پتھر ہم آئینہ دکھا کے

اس زلفِ خم بہ خم کا سر سے گیا نہ سودا
دنیا نے ہم کو دیکھا سو بار آزما کے

جالبؔ ہوا قفس میں یہ راز آشکارا
اہلِ جنوں کے بھی تھے کیا حوصلے بلا کے

○

دشمنوں نے جو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

خامشی پر ہیں لوگ زیرِ عتاب
اور ہم نے تو بات بھی کی ہے

مطمئن ہے ضمیر تو اپنا
بات ساری ضمیر ہی کی ہے

اپنی تو داستاں ہے بس اتنی
غم اٹھائے ہیں شاعری کی ہے

اب نظر میں نہیں ہے ایک ہی پھول
فکر ہم کو کلی کلی کی ہے

پاسکیں گے نہ عمر بھر جس کو
جستجو آج بھی اُسی کی ہے

جب مہ و مہر بجھ گئے جالبؔ
ہم نے اشکوں سے روشنی کی ہے

شامِ غم کو سحر کہوں کیسے
دوستوں کو فریب دوں کیسے

دار تک سب پہنچ گئے ہیں یار
دوش پر سر لئے پھروں کیسے

عمر بھر ساتھ چلنے والوں کو
یوں سرِ راہ چھوڑ دوں کیسے

اب کہاں خوں اسے پلانے کو
اُس ستمگر سے اب مِلوں کیسے

دو قدم پر ہے منزلِ جاناں
اب رہِ عشق میں رُکوں کیسے

مجھ میں جب تک ہے زندگی باقی
ظلم سے ہار مان لوں کیسے

قاتلِ مہر و ماہ کو جالبؔ
امن کی روشنی کہوں کیسے

یہ منصف بھی تو قیدی ہیں ہمیں انصاف کیا دیں گے
لکھا ہے ان کے چہروں پر جو ہم کو فیصلہ دیں گے

اٹھائیں لاکھ دیواریں طلوعِ مہر تو ہو گا
یہ شب کے پاسباں کب تک نہ ہم کو راستہ دیں گے

ہمیں تو شوق ہے اہلِ جنوں کے ساتھ چلنے کا
نہیں پروا ہمیں یہ اہلِ دانش کیا سزا دیں گے

ہمارے ذہن میں آزاد مستقبل کا نقشہ ہے
زمیں کے ذرّے ذرّے کا مقدّر جگمگا دیں گے

ہمارے قتل پر جو آج ہیں خاموش کل جالبؔ
بہت آنسو بہائیں گے بہت دادِ وفا دیں گے

عہدِ سزا

یہ ایک عہد سزا ہے جزا کی بات نہ کر
دُعا سے ہاتھ اٹھا رکھ' دَوا کی بات نہ کر

خدا کے نام پہ ظالم نہیں یہ ظُلم روا
مجھے جو چاہے سزا دے خدا کی بات نہ کر

حیات اب تو انہی مجبسوں میں گزرے گی
ستم گروں سے کوئی التجاء کی بات نہ کر

انہی کے ہاتھ میں پتھر ہیں جن کو پیار کیا
یہ دیکھ حشر ہمارا وفا کی بات نہ کر

ابھی تو پائی ہے میں نے رہائی رہزن سے
بھٹک نہ جاؤں میں پھر رہنما کی بات نہ کر

بجھا دیا ہے ہوا نے ہر اک دِیا کا دیا
نہ ڈھونڈ اہل کرم کو دِیا کی بات نہ کر

نزولِ حبس ہُوا ہے فلک سے اے جالبؔ
گھُٹا گھُٹا ہی سہی دم گھٹا کی بات نہ کر

دل کی شکستگی کے ہیں آثار پھر بہت
اہلِ جفا ہیں درپئے آزاد پھر بہت

جو لفظ کھا گئے تھے چمن کی شگفتگی
ہر صبح لکھ رہے ہیں وہ اخبار پھر بہت

جو بچ رہا ہے اس کو گنوانے کے واسطے
کوشاں ہیں اہلِ جبّہ و دستار پھر بہت

○

دکھ اٹھانے میں ہے کمال ہمیں
کرگیا فن یہ لازوال ہمیں

بیادشاہ عبداللطیف بھٹائی

پچھلے دنوں جو بلوانوں نے یہاں قیامت ڈھائی
اُس پر کیا کیا دل رویا ہے پوچھ نہ شاہ بھٹائی

اپنی اپنی سوچ ہے پیارے اپنا اپنا دل ہے
تو نے لیں قاتل کی بلائیں آنکھ مری بھر آئی

میں نے اتنی دُور سے خوں بہنے کا شور سُنا ہے
پاس ہی رہنے والوں تک کوئی آواز نہ آئی

یوسف کے قصے سے ہم کو یہ ادراک ہوا ہے
مال منال کے سب ہیں بندے کون کسی کا بھائی

تخت و تاج کی افسوں کاری اندھا کر دیتی ہے
ہر سچ کی پہچان سے عاری ہوتی ہے دارائی

جھوٹی خبریں گھڑنے والے جھوٹے شعر سنانے والے
لوگو صبر کہ اپنے کیے کی جلد سزا ہیں پانے والے

درد تو آنکھوں سے بہتا ہے اور چہرہ سب کچھ کہتا ہے
یہ مت لکھّو وہ مت لکھّو آئے بڑے سمجھانے والے

خود کاٹیں گے اپنی مشکل خود پائیں گے اپنی منزل
راہزنوں سے بھی بدتر ہیں راہنما کہلانے والے

ان سے پیار کیا ہے ہم نے ان کی راہ میں ہم بیٹھے ہیں
ناممکن ہے جن کا ملنا اور نہیں جو آنے والے

ان پر بھی ہنستی تھی دنیا آوازے کستی تھی دُنیا
جالبؔ اپنی ہی صورت تھے عِشق میں جاں سے جانے والے

تیرے ہونے سے

دل کی کونپل ہری تیرے ہونے سے ہے
زندگی، زندگی تیرے ہونے سے ہے

کِشت زاروں میں تو، کارخانوں میں تُو
ان زمینوں میں تو، آسمانوں میں تُو

شعر میں، نثر میں، داستانوں میں تُو
شہر و صحرا میں تُو اور چٹانوں میں تُو

حُسنِ صورت گری تیرے ہونے سے ہے
زندگی، زندگی تیرے ہونے سے ہے

تجھ سے ہے آفرینش، نمو، ارتقاء
تجھ سے ہیں قافلے، راستے، رہنُما

تو نہ ہوتی تو کیا تھا چمن، کیا صبا
کیسے کٹتا سفر درد کا یاس کا

آس کی روشنی تیرے ہونے سے ہے
زندگی، زندگی تیرے ہونے سے ہے

خوف و نفرت کی ہر حد مٹانے نکل
عقل و دانش کی شمعیں جلانے نکل

زیر دستوں کی ہمّت بندھانے نکل
ہم خیال اور اپنے بنانے نکل

لب کُشا بے کسی تیرے ہونے سے ہے
زندگی، زندگی تیرے ہونے سے ہے

نذرِ مصحفی

اک شخص باضمیر مرا یار مصحفی
میری طرح وفا کا پرستار مصحفی

رہتا تھا کج کلاہ امیروں کے درمیاں
یکسر لئے ہوئے مرا کردار مصحفی

دیتے ہیں داد غیر کو کب اہل لکھنؤ
کب داد کا تھا ان سے طلب گار مصحفی

ناقدری جہاں سے کئی بار آکے تنگ
اک عمر شعر سے رہا بے زار مصحفی

دربار میں تھا بار کہاں اس غریب کو
برسوں مثالِ میر پھرا خوار مصحفی

میں نے بھی اس گلی میں گزاری ہے رو کے عمر
ملتا ہے اس گلی میں کسے پیار مصحفی

ناداں نہیں ہیں یار

جن کو جہاں کا غم ہے وہ معدودے چند ہیں
ورنہ تمام اپنی ترقی پسند ہیں

دشتِ وفا میں ساتھ ہمارے وہ کیوں چلیں
ناداں نہیں ہیں یار بڑے ہوشمند ہیں

○

بہت روشن ہے شامِ غم ہماری
کسی کی یاد ہے ہم دم ہماری

غلط ہے لاتعلّق ہیں چمن سے
تمہارے پھول اور شبنم ہماری

یہ پلکوں پر نئے آنسو نہیں ہیں
ازل سے آنکھ ہے پُرنم ہماری

ہر اک لب پر تبسّم دیکھنے کی
تمنا کب ہوئی ہے کم ہماری

کہی ہے ہم نے خود سے بھی بہت کم
نہ پوچھو داستانِ غم ہماری

ظلمت کو جو فروغ ہے دیدہ وروں سے ہے
یہ کاروبارِ شب انہی سوداگروں سے ہے

اٹھیں تو ہر غرورِ شہی خاک میں ملے
قصرِ بلند بام، خمیدہ سروں سے ہے

یہ اور بات اس پہ مسلّط ہیں بدنہاد
یہ خوش نما دیار ہمیں بے گھروں سے ہے

کیا عقل کیا شعور کی باتیں کریں یہاں
سر کو معاملہ تو یہاں پتھروں سے ہے

اب سے نہیں ہیں تشنہ لبوں کو شکایتیں
یہ میکدہ تو کب سے تہی ساغروں سے ہے

ملاقات

جو ہو نہ سکی بات وہ چہروں سے عیاں تھی
حالات کا ماتم تھا ملاقات کہاں تھی

اس نے نہ ٹھہرنے دیا پہروں مرے دل کو
جو تیری نگاہوں میں شکایت مری جاں تھی

گھر میں بھی کہاں چین سے سوئے تھے کبھی ہم
جو رات ہے زنداں میں وہی رات وہاں تھی

یکساں ہیں مری جان قفس اور نشیمن
انسان کی توقیر یہاں ہے نہ وہاں تھی

شاہوں سے جو کچھ ربط نہ قائم ہوا اپنا
عادت کا بھی کچھ جبر تھا کچھ اپنی زبان تھی

صیّاد نے یونہی تو قفس میں نہیں ڈالا
مشہور گلستاں میں بہت میری فغاں تھی

تو ایک حقیقت ہے مری جاں مری ہمدم
جو تھی مری غزلوں میں وہ اک وہم و گماں تھی

محسوس کیا میں نے ترے غم سے غمِ دہر
ورنہ مرے اشعار میں یہ بات کہاں تھی

لمبی نہیں ہے ظلم کی عمر

ہم اور اپنوں کے کیا پاس چھوڑ آئے ہیں
یہی کہ دہشت و افلاس چھوڑ آئے ہیں

ہماری قید سے لمبی نہیں ہے ظلم کی عمر
یہی حسین سا احساس چھوڑ آئے ہیں

کسی بھی شام نہ آئے گی مے کی یاد ہمیں
درِ قفس سے اُدھر پیاس چھوڑ آئے ہیں

ہماری ذکر سے خالی نہ ہوگی بزم کوئی
ہم اپنے ذہن کی وہ باس چھوڑ آئے ہیں

چلے تھے جب تو نہ تھا رنگِ یاس چہروں پر
دلوں میں ایک عجب آس چھوڑ آئے ہیں

میر و غالب بنے یگانہ بنے
آدمی اے خدا نہ بنے

موت کی دسترس میں کب سے ہیں
زندگی کا کوئی بہانہ بنے

اپنا شاید یہی تھا جرم اے دوست
با وفا بن کے بے وفا نہ بنے

ہم پہ اک اعتراض یہ بھی ہے
بے نوا ہو کے بے نوا نہ بنے

یہ بھی اپنا قصور کیا کم ہے
کسی قاتل کے ہم نوا نہ بنے

کیا گلہ سنگدل زمانے کا
آشنا ہی جب آشنا نہ بنے

چھوڑ کر اس گلی کو اے جالبؔ
اک حقیقت سے ہم فسانہ بنے

نہ کوئی شب ہو شبِ غم یہ سوچتے ہیں ہم
کسی کی آنکھ نہ ہو نم' یہ سوچتے ہیں ہم

گلہ گزار نہ ہو کوئی چشم ساقی کا
کسی پہ لطف نہ ہو کم' یہ سوچتے ہیں ہم

کسی کے لب پہ نہ ہو داستانِ تشنہ لبی
زمیں پہ کوئی نہ ہو جم' یہ سوچتے ہیں ہم

زمیں پہ آگ نہ برسے فضا سدا مہکے
بپا نہ ہو کہیں ماتم' یہ سوچتے ہیں ہم

کرے نہ کوئی زمانے میں جنگ کی باتیں
جھکے نہ امن کا پرچم' یہ سوچتے ہیں ہم

کسی کا حق ہے سمندر پہ اور کوئی پیاسا
یہ کیا ہے' کیوں ہے یہ عالم' یہ سوچتے ہیں ہم

سفر ہے شب کا دِل ہمرہاں بجھے نہ کہیں
لگن کی لو نہ ہو مدھم' یہ سوچتے ہیں ہم

سچ کہہ کے کسی دور میں پچھتائے نہیں ہم
کردار پہ اپنے کبھی شرمائے نہیں ہم

زنداں کے درو بام ہیں دیرینہ شناسا
پہنچے ہیں سرِدار تو گھبرائے نہیں ہم

ایک یاد

کچے آنگن کا وہ گھر وہ بام و در
گاؤں کی پگڈنڈیاں وہ رہ گزر
وہ ندی کا سُرمئی پانی شجر
جا نہیں سکتا بجا ان تک مگر
سامنے رہتے ہیں وہ شام و سحر

رخشندہ زویا سے

(13 اپریل 1981ء جیل کی ایک ملاقات پر)

کہہ نہیں سکتی پر کہتی ہے
مجھ سے میری ننھی بچی
ابو گھر چل
ابو گھر چل
اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا
کیوں زنداں میں رہ جاتا ہوں
کیوں نہیں ساتھ میں اُس کے چلتا
کیسے ننھی کو سمجھاؤں
گھر بھی تو زنداں کی طرح ہے

(کوٹ لکھپت جیل)

ہتھکڑی

اُس کو شایَد کھلونا لگی ہتھکڑی
میری بچّی مجھے دیکھ کر ہنس پڑی

یہ ہنسی تھی سحر کی بشارت مجھے
یہ ہنسی دے گئی کتنی طاقت مجھے

کس قدر زندگی کو سہارا ملا
ایک تابندہ کَل کا اشارا ملا

کیسے کہیں کہ یادِ یار جا رات جاچکی بہت
رات بھی اپنے ساتھ ساتھ آنسو بہا چکی بہت

چاند بھی ہے تھکا تھکا تارے بھی ہیں بُجھے بُجھے
ترے ملن کی آس پھر دیپ جلا چکی بہت

آنے لگی ہے یہ صدا دور نہیں ہے شہرِ گُل
دُنیا ہماری راہ میں کانٹے بِچھا چکی بہت

کھلنے کو ہے قفس کا در پانے کو ہے سکوں نظر
اے دلِ زار شامِ غم ہم کو رُلا چکی بہت

اپنی قیادتوں میں اب ڈھونڈیں گے لوگ منزلیں
راہزنوں کی رہبری راہ دکھا چکی بہت

ہوتا ہے سرِ شام سلاخوں کا جو در بند
کر لیتے ہیں ہم بھی کئی مہتاب نظر بند

ترسیں گی اجالوں کو شبِ غم کی نگاہیں
ہو جائے گا جس روز مرا دیدۂ تر بند

رستہ کہاں سورج کا کوئی روک سکا ہے
ہوتی ہے کہاں رات کے زنداں میں سحر بند

جینا ہمیں آتا ہے بہر طور مری جاں
کرتے رہیں وہ زیست کی ہر راہ گزر بند

ہے فرض تجھی پر کہ ہر اک عہد میں جالبؔ
آلام اٹھائے جا زباں اپنی نہ کر بند

ملا کرتی نہیں عظمت یونہی تو
یہ ہاتھ آتی نہیں دولت یونہی تو

وفا کی ہے سدا اہلِ جنوں سے
نہیں حاصل ہوئی شہرت یونہی تو

بنایا آپ اسے جاتا ہے پیارے
بنا کرتی نہیں قسمت یونہی تو

رہا نا آشنا تو بھی ہے ہمدم
قفس میں ہے مری صورت یونہی تو

نہیں حق چھینتے ہم غاصبوں سے
مقدّر میں ہے ہر ذلّت یونہی تو

بھکاری ہیں زمانے کی نظر میں
کوئی کرتا نہیں عزّت یونہی تو

ہیں قصر اُن کے ہماری ہڈیوں پر
مجھے شاہوں سے ہے نفرت یونہی تو

علاج اس میں نہیں سب کے دُکھوں کا
نظامِ زر سے ہے نفرت یونہی تو

دل پر جو زخم ہیں وہ دکھائیں کسی کو کیا
اپنا شریکِ درد بنائیں کسی کو کیا

ہر شخص اپنے اپنے غموں میں ہے مبتلا
زنداں میں اپنے ساتھ رُلائیں کسی کو کیا

بچھڑے ہوئے وہ یار وہ چھوڑے ہوئے دیار
رہ رہ کے ہم کو یاد جو آئیں کسی کو کیا

رونے کو اپنے حال پہ تنہائی ہے بہت
اُس انجمن میں خود پہ ہنسائیں کسی کو کیا

وہ بات چھیڑ جس میں جھلکتا ہو سب کا غم
یادیں کسی کی تجھ کو ستائیں کسی کو کیا

سوئے ہوئے ہیں لوگ تو ہوں گے سکون سے
ہم جاگنے کا روگ لگائیں کسی کو کیا

جالبؔ نہ آئے گا کوئی احوال پوچھنے
دیں شہرِ بے حساں میں صدائیں کسی کو کیا

اے دلِ وہ تمہارے لئے بے تاب کہاں ہیں
دُھندلائے ہوئے خواب ہیں احباب کہاں ہیں

ان پر بھی شبِ غم اسی صورت ہے مسلّط
اپنی ہی طرح وہ بھی سکوں یاب کہاں ہیں

آتے ہیں نظر بے سرو ساماں ہی قفس میں
حاکم جنہیں [illegible] ہے وہ نوآب کہاں ہیں

اب نالہ و شیون کی صدائیں نہیں آتیں
اے درد کی شب وہ ترے بے تاب کہاں ہیں

دن ہی کوئی روشن نہ کوئی رات منوّر
خورشید کہاں ہیں مرے مہتاب کہاں ہیں

تو شکوہ سرا ہے تو کبھی آہ بہ لب ہے
زنداں کے مری جان یہ آداب کہاں ہیں

وہ جام بکف شام نہ وہ صحبتِ یاراں
جینے کے ترے شہر میں اسباب کہاں ہیں

○

ہم جو اب تک اٹھا رہے ہیں ستم
شاید اپنا جگر ہے آہن کا

ہر کلی کی ہے آنکھ میں آنسو
حال کیا ہوگیا ہے گلشن کا

جو سپہ عورتوں سے ڈرتی ہے
سامنا کیا کرے گی دشمن کا

حیف زنداں میں ڈال رکھا ہے
کم نگاہوں نے حُسن آنگن کا

دھن کی دنیا ہے دھن کے سب دھندے
کوئی ہوتا نہیں ہے نِر دھن کا

جس کی بجنی الگ ہو زنداں میں
کیا اٹھائے وہ لُطف ساون کا

یاد آتا ہے ہم کو زنداں میں
گاؤں اپنا زمانہ بچپن کا

گیت گاتی ہے جو مرے من کے
شوق ہے مجھ کو اس کے درشن کا

دکھ کے سائے سمٹنے لگتے ہیں
کیا جواب اس نوائے روشن کا

یہ سوچ کر نہ مائلِ فریاد ہم ہوئے
آباد کب ہوئے تھے کہ برباد ہم ہوئے

ہوتا ہے شاد کام یہاں کون باضمیر
ناشاد ہم ہوئے تو بہت شاد ہم ہوئے

پرویز کے جلال سے ٹکرائے ہم بھی ہیں
یہ اور بات ہے کہ نہ فرہاد ہم ہوئے

کچھ ایسے بھا گئے ہمیں دُنیا کے درد و غم
کوئے بتاں میں بھولی ہوئی یاد ہم ہوئے

جالبؔ تمام عمر ہمیں یہ گماں رہا
اس زلف کے خیال سے آزاد ہم ہوئے

نگاہوں کے قفس میں اور ہوں چہروں کے زنداں میں
اگر ہو میرے بس میں تو نکل جاؤں بیاباں میں

جسے مِلیئے ہمیں اس شہر میں دیوانہ کہتا ہے
نہ جانے کیا خرابی ہے مری جاں عشقِ انساں میں

ترحّم کی نگاہوں سے نہ مجھ کو دیکھ اے دنیا
رہا ہے ہاتھ میرا بھی ہر اک شہ کے گریباں میں

وہی ہیں صاحبِ توفیق بھی یارو کدھر جائیں
سُنا کر شعر دکھ ہوتا ہے بزمِ ناشناساں میں

کہیں سے بھی صدائے نالہ و شیون نہیں آتی
عجب اک ہُو کا عالم ہے دیارِ درد منداں میں

منصف ہوئے بیدار اسیروں کی فغاں سے
الجھے ہیں کچھ انوار اندھیروں کے جہاں سے

اک زلف کی خاطر نہیں، انصاف کی خاطر
ٹکرائے ہیں ہر دور میں ہم کوہِ گراں سے

نظروں میں وہی زلف کے خم عارض و لب ہیں
نکلے ہیں کہاں آج بھی ہم کوئے بتاں سے

اُبھرے نہیں ہم سطح سے دو گز بھی مری جاں
ہو آئے ہیں اغیار مہ و کاہکشاں سے

نقاد تو بن جائیں گے حاسد مرے جالبؔ
لائیں گے مِرا حُسنِ ودیعت وہ کہاں سے

دلِ پُر شوق کو پہلو میں دبائے رکھا
تجھ سے بھی ہم نے ترا پیار چھپائے رکھا

چھوڑ اس بات کو اے دوست کہ تجھ سے پہلے
ہم نے کس کس کو خیالوں میں بسائے رکھا

غیر ممکن تھی زمانے کے غموں سے فرصت
پھر بھی ہم نے ترا غم دل میں بسائے رکھا

پھول کو پھول نہ کہتے سو اسے کیا کہتے
کیا ہوا غیر نے کالر پہ سجائے رکھا

جانے کس حال میں ہیں کون سے شہروں میں ہیں وہ
زندگی اپنی جنہیں ہم نے بنائے رکھا

ہائے کیا لوگ تھے وہ لوگ پری چہرہ لوگ
ہم نے جن کے لئے دنیا کو بھلائے رکھا

اب ملیں بھی تو نہ پہچان سکیں ہم ان کو
جن کو اک عمر خیالوں میں بسائے رکھا

صدا تو دے

زمیں پہ ہیں کہ سرِ آسماں ہیں اے دنیا
ہمارا ذکر بھی کر ہم کہاں ہیں اے دنیا

تو مسکرائے سدا چین سے رہے آباد
ترے سکوں کے لئے ہی رواں ہیں اے دنیا

ترے چمن کی بہاروں کے ہم محافظ ہیں
ہمیں نہ بھول ترے پاسباں ہیں اے دنیا

ہے تجھ پہ چھائی ہوئی موت کی خموشی کیوں
صدا تو دے تیرا نام و نشاں ہیں اے دُنیا

○

جنہیں ہم چاہتے ہیں والہانہ
وہ اپنے قاتلوں کو چاہتے ہیں

ہمیں آسانیاں کیوں ہوں میسر
کہ ہم خود مشکلوں کو چاہتے ہیں

ہمیں ہے عشق بڑھتے فاصلوں سے
گریزاں منزلوں کو چاہتے ہیں

○

غریبوں کا گلشن جلا ہی کرے ہے
خدا جو کرے ہے بھلا ہی کرے ہے
نہیں جس کو آتا مقدّر بنانا
یونہی ہاتھ اپنے ملا ہی کرے ہے

○

بکھیری زلف جب کالی گھٹا نے
نظر میں پھر گئے بیتے زمانے

جنوں کچھ اور بھی نکھرا ہمارا
بگاڑا کچھ نہ صحرا کی ہوا نے

میانوالی میں کرکے قید مجھ کو
بہت احساں کیا اہلِ جفا نے

ہُوا اس شہر میں محرؔوم پیدا
لکھے اس نے یہاں دل کے فسانے

بنایا شہرِ جاں ریگِ رواں کو
محبت سے محبت آشنا نے

مجھُے مٹتے دکھائی دے رہے ہیں
یہ زنداں اور یہ مقتل پرُانے

گریں گی نفرتوں کی سب فصیلیں
یہاں گونجیں گے الفت کے ترانے

میانوالی مرا، لاہور میرا
مجھے لگتے ہیں سب منظر سہانے

قفس میں مر چلے تھے ہم تو جالبؔ
بچایا ہم کو آوازِ لتا نے

سوجا

سوگیا شہر تو بھی اب سو جا
آپ ڈھل جائے گی یہ شب سو جا
سو گئے خامشی بتاتی ہے
جاگنے والے سب کے سب سو جا

شعر سے شاعری سے ڈرتے ہیں
کم نظر روشنی سے ڈرتے ہیں
لوگ ڈرتے ہیں دشمنی سے تیری
ہم تری دوستی سے ڈرتے ہیں
دہر میں آہِ بے کساں کے سوا
اور ہم کب کسی سے ڈرتے ہیں
ہم کو غیروں سے ڈر نہیں لگتا
اپنے احباب ہی سے ڈرتے ہیں
داورِ حشر بخش دے شاید
ہاں مگر مولوی سے ڈرتے ہیں
روٹھتا ہے تو روٹھ جائے جہاں
ان کی ہم بے رُخی سے ڈرتے ہیں
ہر قدم پر ہے محتسب جالبؔ
اب تو ہم چاندنی سے ڈرتے ہیں

اور کیا اس کے سوا چاہتے ہیں
نوعِ انساں کا بھلا چاہتے ہیں

ان کی دانست پہ آتی ہے ہنسی
جو ہماری بھی دُعا چاہتے ہیں

کتنے ناداں ہیں کہ ہر قاتل سے
اپنے ہم دُکھ کی دوا چاہتے ہیں

ہم بھی غالبؔ کی طرح اے جالبؔ
نہ ستائش نہ صلا چاہتے ہیں

○

آج اپنا ہے نہ کل تھا اپنا
کیوں کہیں تاج محل تھا اپنا

ایسا اُجڑا نہ ہوا پھر آباد
ہاں جو اک شہرِ غزل تھا اپنا

کوئی شعر نیا کوئی بات نئی کہنے کا جتن کرتے رہنا
انمول ہے پل پل جیون کا آہیں نہ یونہی بھرتے رہنا

کچھ کام نہیں آتی آہیں چلنے سے سمٹتی ہیں راہیں
تقدیر پہ کیا تہمت یارو بیٹھے بیٹھے دھرتے رہنا

سر ڈال کے چلتے رہنے سے کچھ اور بھی اُونچی ہوتی ہیں
دیواریں تو ہیں دیواریں ہی دیواروں سے کیا ڈرتے رہنا

دنیا کو اگر سُلجھا لیں گے ہر منزل کو ہم پالیں گے
اک زلف کے غم میں کیا جالبؔ جیتے رہنا مرتے رہنا

○

اگر ہے تو بس حُسن کی ذات بر حق
اگر ہے تو بس عشق کی بات اچھی

درِ میکدہ پر ملے شیخ صاحب
رہی آج ان سے ملاقات اچھی

سبھی بادہ خوار اُٹھ گئے ہیں وہ جالبؔ
کہ جن سے تھی شامِ خرابات اچھی

○

وہ کنارِ جُو ملاقاتیں گئیں
ساتھ ان کے چاندنی راتیں گئیں

دِل عجب قِصّوں میں اب ہے مبتلا
گیسُو و رُخسار کی باتیں گئیں

غمِ وطن جو نہ ہوتا تو مقتدر ہوتے
ہم آسماں کے برابر زمین پر ہوتے

ہمیں خیال نہ ہوتا جو بے نواؤں کا
قفس میں یوں نہ سلگتے ہم اپنے گھر ہوتے

نشاط و عیش سے کرتے بسر حیات اپنی
نہ بے کسی پہ کسی کی جو چشم تر ہوتے

جُھکا کے سر کو جو چلتے تو رفعتیں پاتے
صعوبتیں نہ اُٹھاتے جو بے ضرر ہوتے

بزرگ راہنما کون پھر اُنہیں کہتا
اگر یہ راہ نما راہ راست پر ہوتے

ہم ہی جب آئیں گے تو بنے گی بات میاں
ورنہ رہیں گے دکھ کے یہی حالات میاں

اب نہ بہیں گے آنسو پیاسی آنکھوں سے
رو رو کر کاٹی ہے بہت برسات میاں

صبح کی کرنیں ہر آنگن میں ناچیں گی
اور کوئی دم کی ہے یہ غم کی رات میاں

پھر نہ کرے گا کوئی بھی شکوہ قسمت کا
باگ ڈور آئے گی جب اپنے ہات میاں

دُکھیاروں کا راج اب آنے والا ہے
ہر ظالم کی ہوگی بازی مات میاں

O

جنوں کے بس میں ہے میرا پری جمال وطن
وہ ظلم اس پہ ہوئے ہیں کہ ہے نڈھال وطن
اسے رہائی ملے تو مری رہائی ہو
ازل سے ہے میری صورت خراب حال وطن

○

جانا ہے تمہیں دہر سے ایمان ہے اپنا
ہم آکے نہیں جائیں گے اعلان ہے اپنا

انساں سے جو نفرت کرے انسان نہیں ہے
ہر رنگ کا ہر نسل کا انسان ہے اپنا

تم امن کے دشمن ہو محبت کے ہو قاتل
دنیا سے مٹانا تمہیں ارمان ہے اپنا

کیوں اپنے رفیقوں کو پریشان کریں ہم
حالات سے دل لاکھ پریشان ہے اپنا

اس شاہ کے بھی ہم نے قصیدے نہیں لکھے
پاس اپنے گواہی کو یہ دیوان ہے اپنا

فرنگی کا جو میں دربان ہوتا
تو جینا کس قدر آسان ہوتا

مرے بچّے بھی امریکہ میں پڑھتے
میں ہر گرمی میں انگلستان ہوتا

مری انگلش بلا کی چُست ہوتی
بلا سے جو نہ اردو دان ہوتا

جھکا کے سر کو ہوجاتا جو سر میں
تو لیڈر بھی عظیم الشان ہوتا

زمینیں میری ہر صوبے میں ہوتیں
میں واللہ صدرِ پاکستان ہوتا

عورتوں کا ترانہ

جہاں ہیں محبوس اب بھی ہم وہ حرم سرائیں نہیں رہینگی
لرزتے ہونٹوں پہ اب ہمارے فقط دعائیں نہیں رہینگی

غصب شدہ حق پہ چُپ نہ رہنا ہمارا منشور ہوگیا ہے
اٹھے گا اب شور ہر ستم پر دبی صدائیں نہیں رہینگی

ہمارے عزمِ جواں کے آگے ہمارے سیلِ رواں کے آگے
پرانے ظالم نہیں ٹکیں گے نئی بلائیں نہیں رہینگی

ہیں قتل گاہیں یہ عدل گاہیں انہیں بھلا کس طرح سراہیں
غلام عادل نہیں رہیں گے غلط سزائیں نہیں رہینگی

بنے ہیں جو خادمانِ ملّت وہ کرنا سیکھیں ہماری عزّت
وگرنہ ان کے بتوں پہ بھی یہ سجی قبائیں نہیں رہینگی

بڑے بنے تھے جالبؔ صاحب پٹے سڑک کے بیچ
گولی کھائی لاٹھی کھائی گرے سڑک کے بیچ

کبھی گریباں چاک ہُوا اور کبھی ہوا دل خوں
ہمیں تو یونہی ملے سخن کے صلے سڑک کے بیچ

جسم پہ جو زخموں کے نشاں ہیں اپنے تمغے ہیں
ملی ہے ایسی داد وفا کی کِسے سڑک کے بیچ

(خواتین کے جلوس پر لاٹھی چارج پر لکھے گئے)

یونہی پیارے کوئی منصور بنا کرتا ہے
حُسن یہ عشقِ صداقت سے ملا کرتا ہے

لاکھ کہتے رہیں وہ چاک گریباں نہ کروں
کبھی دیوانہ بھی پابند ہُوا کرتا ہے

اِذن سے لکھنے کا فن ہم کو نہ اب تک آیا
وہی لکھتے ہیں جو دل ہم سے کہا کرتا ہے

اُس کے ممنون ہی ہو جاتے ہیں درپے اُس کے
کیا بُرا کرتا ہے جو شخص بھلا کرتا ہے

اس کی آواز سُنو شہر کے دانشمندو
دُور پربت پہ کوئی آہ و بکا کرتا ہے

روز کر جاتا ہے کچھ اور پریشان مجھ کو
خوب اخبار مرے دُکھ کی دوا کرتا ہے

آج یہ عیب ہے جالبؔ تجھے معلوم نہیں
جان کر حُسن تو ہر اک سے وفا کرتا ہے

نذرِ شہداء

بنائے ہیں سلطاں فرنگی کے درباں
بہت خوب کی قدرِ خونِ شہیداں

رہِ حق میں جاں اپنی دے کے مری جاں
بہت کر گئے منزلوں کو وہ آساں

مناتے ہیں چھُپ چھُپ کے ہم ان کی یادیں
جو باطل شکن تھے جو تھے مردِ میداں

رُخِ زندگی پر جو کچھ زندگی ہے
اُنہی کا کرم ہے انہی کا ہے احساں

وہ آزادیوں کے تھے خورشید جالبؔ
انہی کے لہو سے کھلے ہیں گلستاں

نذرِ مارکس

یہ جو شب کے ایوانوں میں اک ہلچل اک حشر بپا ہے
یہ جو اندھیرا سمٹ رہا ہے یہ جو اجالا پھیل رہا ہے

یہ جو ہر دکھ سہنے والا دکھ کا مداوا جان گیا ہے
مظلوموں مجبوروں کا غم یہ جو مرے شعروں میں ڈھلا ہے

یہ جو مہک گلشن گلشن ہے یہ جو چمک عالم عالم ہے
مارکسزم ہے مارکسزم ہے مارکسزم ہے

بیادِ فیضؔ

فیض اور فیضؔ کا غم بھولنے والا ہے کہیں
موت یہ تیرا ستم بھولنے والا ہے کہیں

ہم سے جس وقت نے وہ شاہِ سُخن چھین لیا
ہم کو وہ وقتِ اَلم بھولنے والا ہے کہیں

تیرے اشک اور بھی چمکائیں گے یادیں اس کی
ہم کو وہ دیدۂ نم بھولنے والا ہے کہیں

کبھی زنداں میں کبھی دُور وطن سے اے دوست
جو کیا اُس نے رقم بھولنے والا ہے کہیں

آخری بار اُسے دیکھ نہ پائے جالبؔ
یہ مُقدّر کا ستم بھولنے والا ہے کہیں

نذرِ ساحرؔ

یوں وہ ظلمت سے رہا دست و گریباں یارو
اس سے لرزاں تھے بہت شب کے نگہباں یارو

اُس نے ہر گام دیا حوصلۂ تازہ ہمیں
وہ نہ اک پل بھی رہا ہم سے گریزاں یارو

اس نے مانی نہ کبھی تیرگئ شب سے شکست
دل اندھیروں میں رہا اس کا فروزاں یارو

اُس کو ہر حال میں جینے کی ادا آتی تھی
وہ نہ حالات سے ہوتا تھا پریشاں یارو

اُس نے باطل سے نہ تازیست کیا سمجھوتہ
دہر میں اس سا کہاں صاحبِ ایماں یارو

اُس کو تھی کشمکشِ دیر و حرم سے نفرت
اُس سا ہندو نہ کوئی اس سا مسلماں یارو

اس نے سلطانی جمہور کے نغمے لکھے
روح شاہوں کی رہی اس سے پریشاں یارو

اپنے اشعار کی شمعوں سے اُجالا کر کے
کرگیا شب کا سفر کتنا وہ آساں یارو

اُس کے گیتوں سے زمانے کو سنواریں آؤ
روحِ ساحرؔ کو اگر کرنا ہے شاداں یارو

بیادِ فراقؔ

کم پرانا بہت نیا تھا فراقؔ
اک عجب رمز آشنا تھا فراقؔ

دُور وہ کب ہوا نگاہوں سے
دھڑکنوں میں بسا ہوا تھا فراقؔ

شامِ غم کے سلگتے صحرا میں
اک امنڈتی ہوئی گھٹا تھا فراقؔ

امن تھا پیار تھا، محبت تھا
رنگ تھا نور تھا، نوا تھا فراقؔ

فاصلے نفرتوں کے مٹ جائیں
پیار ہی پیار سوچتا تھا فراقؔ

ہم سے رنج و الم کے ماروں کو
کس محبت سے دیکھتا تھا فراقؔ

عشق انسانیت سے تھا اس کو
ہر تعصب سے ماورا تھا فراقؔ

بیادِ جوشؔ

ہم نے دل سے تجھے سدا مانا
تو بڑا تھا تجھے بڑا مانا

میرؔ و غالبؔ کے بعد انیسؔ کے بعد
تجھ کو مانا بڑا بجا مانا

تو کہ دیوانۂ صداقت تھا
تو نے بندے کو کب خدا مانا

تجھ کو پروا نہ تھی زمانے کی
تو نے دل ہی کا ہر کہا مانا

تجھ کو خود پہ تھا اعتماد اتنا
خود ہی کو تو نے رہنماء مانا

کی نہ شب کی کبھی پذیرائی
صبح کو لائقِ ثنا مانا

ہنس دیا سطحِ ذہنِ عالم پر
جب کسی بات کا بُرا مانا

یوں تو شاعر تھے اور بھی اے جوش
ہم نے تجھ سا نہ دوسرا مانا

یوسف کامران

اوجھل ہوا ہے جب سے وہ چہرہ بہار سا
عالم تمام لگنے لگا ہے غبار سا

وہ کیا اٹھا یقین زمانے سے اُٹھ گیا
وہ تھا تو اس جہاں پہ تھا کچھ اعتبار سا

کذب و ریا سے اُس کا کوئی واسطہ نہ تھا
جیتا وہ کس طرح سے یہاں بن کے پارسا

اس سے ملے بغیر نہ آتا تھا ہم کو چین
رہتا تھا وہ ہمارے لئے بے قرار سا

کِس کو دکھائیں داغ کہیں کس سے حالِ دل
اب کون اس جہاں میں ہے اس غمگسار سا

اس سے دیارِ دیدہ و دل تھا چمن چمن
وہ تھا جو ایک اُس کا ہمیں انتظار سا

لے کر پھرے ہیں دل کو بہت دشت و باغ میں
سایہ نہ مل سکا کہیں دیوارِ یار سا

دشوار کب تھے اس کی رفاقت میں مرحلے
جالبؔ نہیں ملے گا کوئی اپنے یار سا

(نذرِ سید سبطِ حسن)

تہذیب تھا' شعور تھا سبطِ حسن تمام
وہ کیا اُٹھا کہ خواب ہوئی انجمن تمام

اُس کو کہاں تھی چند گلُوں کی بقاء عزیز
اُس کو تو آرزُو تھی کہ مہکے چمن تمام

اُس کی نگارشات سے بڑھتی رہے گی بات
ہوگا نہ ارتقاء کا کبھی بانک پن تمام

سیکھیں گے اور سکھائیں گے کیسے کریں حیات
اُس کے خیال و فکر سے اہلِ سخن تمام

لیتی ہے زیست اُن کے قدم اُس نے سچ کہا
ڈرتے نہیں ہیں موت سے جب مرد و زن تمام

غاصب نہیں رہیں گے وہ کیا خوب کہہ گیا
اُٹھیں گے جب عتاب زدہ خستہ تن تمام

چرچا ہے اس کے نام کا جالبؔ گلی گلی
جاگے ہیں اُس کی سوچ سے کوہ و دمن تمام

(بیادسید سبط حسن)

رُوٹھ جاؤں تو محبت سے منانے والا
اب کہاں کوئی مرے ناز اُٹھانے والا

سر کے بل جاتے ہیں دربار میں سب اہلِ قلم
کون اب میری طرح سر نہ جُھکانے والا

عمُر بھر وہ بھی رہا قصر نشینوں سے الگ
دامِ زرتار میں وہ بھی تھا نہ آنے والا

حُکمرانوں کا رہا وہ بھی مُلازم نہ مشیر
اُس کو آتا تھا کہاں کام زمانے والا

خواب میں محو تھا خاموش پڑا تھا کیسے
خواب سے سارے زمانے کو جگانے والا

میں بھی ہوں آپ بھی ہیں کون مگر اُس جیسا
دشمنِ تاج وراں تخت گِرانے والا

رَونقِ بزمِ جہاں یُونہی رہے گی جالبؔ
کچھ مگر اور تھا وہ رنگ جمانے والا

مشروط رہائی

دوستو جگ ہنسائی نہ مانگو
موت مانگو، رہائی نہ مانگو

عمر بھر سر جُھکائے پھرو گے
سب سے نظریں بچائے پھرو گے

مل رہا ہے جو بارِ ندامت
دل پہ کیسے اٹھائے پھرو گے

اپنے حق میں برائی نہ مانگو
موت مانگو رہائی نہ مانگو

ہم ہیں جن کے ستم کا نشانہ
مت کہو ان سے غم کا فسانہ

پھر کہاں جمگھٹا یہ میسر
بن گیا ہے قفس آشیانہ

اب قفس سے جدائی نہ مانگو
موت مانگو رہائی نہ مانگو

رات سے روشنی مانگنا کیا
موت سے زندگی مانگنا کیا

ظُلم کی ظلمتوں سے مری جاں
جوت انصاف کی مانگنا کیا

غاصبوں سے بھلائی نہ مانگو
موت مانگو رہائی نہ مانگو

گیت

یہ بھی وقت گزر جائے گا
رات اگر غم کی آئی ہے
دن خوشیوں کا بھی آئے گا
یہ بھی وقت گزر جائے گا

غم سے مت گھبرانا ساتھی
ہمت ہار نہ جانا ساتھی
ملے گی منزل، کٹے گی مشکل
ہر دکھیارا سُکھ پائے گا
یہ بھی وقت گزر جائے گا

جان ہے کیا شے آن کے آگے
انساں کیا جو غم سے بھاگے
ہر دُکھ سہہ جا دل کی کہہ جا
گیت یہ جگ تیرے گائے گا
یہ بھی وقت گزر جائے گا

آنکھ کھلی تو ہم تھے قفس میں
اب بھی ہے سب کچھ غیر کے بس میں
سوگ ہے گھر گھر گنبدِ بے در
اور الم کیا دکھلائے گا
یہ بھی وقت گزر جائے گا

کھل جائیں گے درزنداں کے
جاگ اٹھیں گے بھاگ انساں کے
دیدۂ پُرنم پیار کا پرچم
چاروں جانب لہرائے گا
یہ بھی وقت گزر جائے گا

ضابطہ

یہ ضابطہ ہے کہ باطل کو مت کہوں باطل
یہ ضابطہ ہے کہ گرداب کو کہوں ساحل

یہ ضابطہ ہے بنوں دست و بازوئے قاتل
یہ ضابطہ ہے دھڑکنا بھی چھوڑ دے یہ دل

یہ ضابطہ ہے کہ غم کو نہ غم کہا جائے
یہ ضابطہ ہے ستم کو کرم کہا جائے

بیاں کروں نہ کبھی اپنے دل کی حالت کو
نہ لاؤں لب پہ کبھی شکوہ و شکایت کرو

کمالِ حسن کہوں عیب کو جہالت کو
کبھی جگاؤں نہ سوئی ہوئی عدالت کو

یہ ضابطہ ہے حقیقت کو اک فسانہ کہوں
یہ ضابط ہے قفس کو بھی آشیانہ کہوں

یہ ضابطہ ہے کہوں دشت کو گلستاں زار
خزاں کے روپ کو لکھوں فروغِ حُسنِ بہار

ہر ایک دشمنِ جاں کو کہوں میں ہمدم و یار
جو کاٹتی ہے سرِ حق وہ چوم لوں تلوار

خطا و جُرم کہوں اپنی بے گناہی کو
سحر کا نور لکھوں رات کی سیاہی کو

جو مٹنے والے ہیں ان کے لئے دوام لکھوں
ثنا یزید کی اور شمر پر سلام لکھوں

جو ڈس رہا ہے وطن کو نہ اس کا نام لکھوں
سمجھ سکیں نہ جسے لوگ وہ کلام لکھوں

دروغ گوئی کو سچّائی کا پیام کہوں
جو راہزن ہے اسے رہبرِ عوام کہوں

مرے جنوں کو نہ پہنا سکو گے تم زنجیر
نہ ہو سکے گا کبھی تم سے میرا ذہن اسیر

جو دیکھتا ہوں، جو سچ ہے کروں گا وہ تحریر
مَتاعِ ہر دو جہاں بھی نہیں بہائے ضمیر

نہ دے سکے گی سہارا تمہیں کوئی تدبیر
فنا تمہارا مُقدّر، بقاء مری تقدیر

یومِ مئی

صدا آ رہی ہے مرے دل سے پیہم
کہ ہو گا ہر اک دُشمنِ جاں کا سرخم

نہیں ہے نظامِ ہلاکت میں کچھ دم
ضرورت ہے انسان کی امنِ عالم

فضاؤں میں لہرائے گا سُرخ پرچم
صدا آ رہی ہے مرے دل سے پیہم

نہ ذلّت کے سائے میں بچّے پلیں گے
نہ ہاتھ اپنے قسمت کے ہاتھوں ملیں گے

مساوات کے دیپ گھر گھر جلیں گے
سب اہلِ وطن سر اُٹھا کر چلیں گے

نہ ہوگی کبھی زندگی وقفِ ماتم
فضاؤں میں لہرائے گا سُرخ پرچم

اے لختِ لختِ دیدہ ورو

بٹے رہو گے تو اپنا یونہی بہے گا لہُو
ہوئے نہ ایک تو منزل نہ بن سکے گا لہُو
ہو کس گھمنڈ میں اے لختِ لختِ دیدہ ورو
تمہیں بھی قاتلِ محنت کشاں کہے گا لہُو
اسی طرح سے اگر تم انا پرست رہے
خود اپنا راہنما آپ ہی بنے گا لہُو
سنو تمہارے گریبان بھی نہیں محفوظ
ڈرو تمہارا بھی اک دن حساب لے گا لہُو
اگر نہ عہد کیا ہم نے ایک ہونے کا
غنیم سب کا یونہی بیچتا رہے گا لہُو
کبھی کبھی مرے بچّے بھی مجھ سے پوچھتے ہیں
کہاں تک اور تو خشک اپنا ہی کرے گا لہُو
سدا کہا یہی میں نے قریب تر ہے وہ دور
کہ جس میں کوئی ہمارا نہ پی سکے گا لہُو

○

آئے سرِ عالم کئی غاصب کئی قاتل
ظلمت کہاں ٹھہری ہے اُجالوں کے مقابل
حق ہی نے کئے پار امنڈتے ہوئے دریا
باطل کو ملا ہے نہ ملے گا کبھی ساحِل

ایک شام

یہ شام نغمہ بہ لب شام خوبصورت شام
یہ شام ایک زمانے کے بعد آئی ہے
یہ شام جام بکف شام رنگ و نور کی شام
خرد کے نام جنوں کا پیام لائی ہے

تمام عمر پڑی ہے غمِ جہاں کے لئے
غمِ جہاں سے نگاہیں ذرا بچالیں آج
بجا کہ محتسبوں کی نظر ہمیں پر ہے
ہر ایک خوف پہ جی بھر کے مسکرالیں آج

سکون لوٹنے والے تو چاہتے ہیں یہی
کہیں سکوں نہ ملے ہم سے غم کے ماروں کو
چمن اداس رہے یونہی اپنے خوابوں کا
یونہی ترستے رہیں ہم حسیں بہاروں کو

کریں بہار کی باتیں صبا کے لہجے میں
کسی حسیں سے کہیں فیضؔ کی غزل گائے
دیارِ دل کو اجالیں عدمؔ کے شعروں سے
رُخِ حیات پہ رنگ آئے روشنی آئے

زمانے بھر کے غموں کو ہے دعوت آزار
ہمارے دل کو نہیں چھو سکے گا غم کوئی
ہمارے ہاتھ میں ہے آفتابِ عالم تاب
فریب آکے دکھائے شبِ الم کوئی

اختر شیرانی مرحوم

○

اور سب بھول گئے حرفِ صداقت لکھنا
رہ گیا کام ہمارا ہی بغاوت لکھنا
لاکھ کہتے رہیں ظلمت کو نہ ظلمت لکھنا
ہم نے سیکھا نہیں پیارے بہ اجازت لکھنا
نہ صلے کی نہ ستائش کی تمنّا ہم کو
حق میں لوگوں کے ہماری تو ہے عادت لکھنا
ہم نے جو بھول کے بھی شہ کا قصیدہ نہ لکھا
شاید آیا اسی خوبی کی بدولت لکھنا
اس سے بڑھ کر مری تحسین بھلا کیا ہوگی
پڑھ کے ناخوش ہیں مرا صاحبِ ثروت لکھنا
دہر کے غم سے ہوا ربط تو ہم بھول گئے
سرو قامت کو جوانی کو قیامت لکھنا
کچھ بھی کہتے ہیں کہیں شہ کے مصاحب جالبؔ
رنگ رکھنا یہی اپنا اسی صورت لکھنا

جاگ مرے پنجاب

جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا
ٹوٹ چلے سب خواب کہ پاکستان چلا

سندھ بلوچستان تو کب سے روتے ہیں
اور اہلِ پنجاب ابھی تک سوتے ہیں

آنکھیں ہیں پُر آب کہ پاکستان چلا
جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا

جن کو ذات کا غم ہے کب وہ مانے ہیں
بے بس لوگوں پر بندوقیں تانے ہیں

قاتل ہیں اسباب کہ پاکستان چلا
جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا

آگ کی بارش سے ہے گلشن دھواں دھواں
روش روش اب کلیوں کی مہکار کہاں

سپنا ہوئے گلاب کہ پاکستان چلا
جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا

زُعم ہے یہ بلوانوں کو ہم جیتیں گے
اور کہوں میں دُکھ کے یہ دن بیتیں گے

جام ہوئے زہراب کہ پاکستان چلا
جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا

افسردہ غزلیں گریاں افسانے ہیں
حد نظر تک پھیلے ہوئے ویرانے ہیں

دریا ہوئے سراب کہ پاکستان چلا
جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا

انہی چلن سے ہم سے جدا بنگال ہوا
پوچھ نہ اس دکھ سے جو دل کا حال ہوا

روکو یہ سیلاب کہ پاکستان چلا
جاگ مرے پنجاب کہ پاکستان چلا

ریفرنڈم

شہر میں ہُو کا عالم تھا
جن تھا یا ریفرنڈم تھا

قید تھے دیواروں میں لوگ
باہر شور بہت کم تھا

کچھ باریش سے چہرے تھے
اور ایمان کا ماتم تھا

مرحُومین شریک ہوئے
سچائی کا چہلم تھا

دِن اُنیس دسمبر کا
بے معنی بے ہنگم تھا

یا وعدہ تھا حاکم کا
یا اخباری کالم تھا

زندہ ہیں ایک عُمر سے دہشت کے سائے میں
دَم گھُٹ رہا ہے اہلِ عبادت کے سائے میں

ہم کو کہاں تصوّرِ جاناں ہُوا نصیب
بیٹھے ہیں ہم کہاں کبھی فرصت کے سائے میں

چھوڑا نہ ہم نے نقش کوئی راہِ عشق میں
گزری تمام عُمر ندامت کے سائے میں

بچھڑے ہوئے دیارِ دل و جاں کے دوستو
پُوچھو نہ دُکھ سہے ہیں جو غُربت کے سائے میں

اے رہروانِ راہِ سحر ہم کو داد دو
لیتے ہیں سانس ظُلم کی ظُلمت کے سائے میں

ہم آئیں گے تو آئے گا وہ عہدِ خوش گوار
گزرے گی جب حیات محبت کے سائے میں

ہوائے جور و ستم سے رُخِ وفا نہ بجُھا
بجھے تمام دیئے ایک یہ دیا نہ بجُھا

فراق و وصل کا لذت شناس ہو کیونکر
جو دل کہ سایۂ مہتاب میں جلا نہ بجُھا

مرے غموں کا مداوا ہے کیا' بتا کھُل کر
پہیلیاں ہی مرے درد آشنا' نہ بجُھا

ہر اہلِ جور کی خواہش رہی ہے میں نہ رہوں
مگر میں ہوں کہ مرا شعلہ نوا نہ بجُھا

مرے خیال میں اب تھک چکے ہیں ظالم بھی
ڈھلے گی ظلم کی شب' دیپ آس کا نہ بجُھا

طلوعِ صُبح کا منظر نظر میں روشن رکھ
شبِ سیاہ میں یہ آتشِ ہوا نہ بجُھا

ہجوم یہ جو ترے سامنے ہے اے ساقی
کر اِس پہ لُطف مری تشنگی بجھا نہ بجھا

سجا کے چہرے پہ غم کو نہ باہر آگھر سے
بجھی نظر سے مرے ہم نشیں فضا نہ بجھا

جدھر نگاہ اٹھائیں کھلے کنول دیکھیں
غزل کہیں کہ مری جان ہم غزل دیکھیں

وہی جمال وہی تمکنت وہی اعجاز
ہزار پل اسے دیکھیں کہ ایک پل دیکھیں

خیالِ مرگِ وفا نے بچالیا ہم کو
کہا جو دل نے کبھی راستہ بدل دیکھیں

جہاں ہماری جواں حسرتوں کا خون ہوا
چلو کہ چل کے وہی کوچہ اجل دیکھیں

کیے ہوئے ہیں دل و جاں نثار ہم جن پر
ہمارے ساتھ کریں کیا سلوک کل دیکھیں

قدم قدم پہ لٹے ہیں جو لوگ اے جالبؔ
رہِ طلب میں ہمارے بھی ساتھ چل دیکھیں

ہجوم دیکھ کے رستہ نہیں بدلتے ہم
کسی کے ڈر سے تقاضا نہیں بدلتے ہم

ہزار زیرِ قدم راستہ ہو خاروں کا
جو چل پڑیں تو ارادہ نہیں بدلتے ہم

اسی لئے تو نہیں معتبر زمانے میں
کہ رنگ صورتِ دُنیا نہیں بدلتے ہم

ہوا کو دیکھ کے جالبؔ مثالِ ہم عصراں
بجا یہ زعم ہمارا نہیں بدلتے ہم

صحافی سے

قوم کی بہتری کا چھوڑ خیال
فکرِ تعمیرِ مُلک دل سے نکال
تیرا پرچم ہے تیرا دستِ سوال
بے ضمیری کا اور کیا ہو مآل
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

یوم اقبال پر

لوگ اُٹھتے ہیں جب تیرے غریبوں کو جگانے
سب شہر کے زردار پہنچ جاتے ہیں تھانے

کہتے ہیں یہ دولت ہمیں بخشی ہے خدا نے
فرسُودہ بہانے وہی افسانے پرانے

اے شاعرِ مشرق! یہی جھوٹے یہی بد ذات
پیتے ہیں لہُو بندۂ مزدُور کا دن رات

ممتاز

قصرِ شاہی سے یہ حکم صادر ہوا، لاڑکانے چلو
ورنہ تھانے چلو
اپنے ہونٹوں کی خوشبو لٹانے چلو، گیت گانے چلو
ورنہ تھانے چلو
منتظر ہیں تمہارے شکاری وہاں کیف کا ہے سماں
اپنے جلووں سے محفل سجانے چلو، مسکرانے چلو
ورنہ تھانے چلو
حاکموں کو بہت تم پسند آئی ہو، ذہن پر چھائی ہو
جسم کی لو سے شمعیں جلانے چلو، غم بھلانے چلو
ورنہ تھانے چلو

○

جدھر جائیں وہی قاتل مقابل
یہ صورت کب نہ تھی اے دل مقابل

فسوں ٹوٹا نہ بڑھتے فاصلوں کا
وہی ہے دوریِ منزل مقابل

عذابِ عہدِ رفتہ سہہ چُکے ہیں
اور اب ہے خوفِ مستقبل مقابل

عجب صحرائے حیرت چار سُو ہے
نہ طوفاں ہے نہ ہے ساحل مقابل

زمیں کو آسماں کہنا نہ آیا
ہمیشہ یہ رہی مشکل مقابل

بچا کر ذہن و دل نکلیں کدھر سے
کہ ہیں ہر گام پر جاہل مقابل

یہ کہہ کر دل کو سمجھاتے ہیں کب سے
رہے گا کب تلک باطل مقابل

نہتّی لڑکی

ڈرتے ہیں بندوقوں والے ایک نہتّی لڑکی سے
پھیلے ہیں ہمّت کے اُجالے ایک نہتّی لڑکی سے

ڈرے ہوئے ہیں مرے ہوئے ہیں لرزیدہ لرزیدہ ہیں
مُلّا، تاجر، جنرل جیالے ایک نہتّی لڑکی سے

آزادی کی بات نہ کر لوگوں سے نہ مِل، یہ کہتے ہیں
بے حِس، ظالم، دل کے کالے ایک نہتّی لڑکی سے

دیکھ کے اِس صُورت کو جالب ساری دُنیا ہنستی ہے
بلوانوں کے پڑے ہیں پالے ایک نہتّی لڑکی سے

○

شہر پہ خوف کے سائے ہیں — یہ کیسے دن آئے ہیں

روتے ہیں پیاسے نیناں — درد کے بادل چھائے ہیں

موت سے لڑنے والے لوگ — گھبرائے گھبرائے ہیں

چاند سے چہرے پھول سے لوگ — مُرجھائے مُرجھائے ہیں

چھوڑ کے ہم اُن گلیوں کو — آوارہ کہلائے ہیں

حال یہ ہے اب تجھ سے بھی — شرمائے شرمائے ہیں

گئے تھے شہر کراچی ہم
آنسو، آہیں لائے ہیں

خامشی سے ہزار غم سہنا
کتنا دشوار ہے غزل کہنا

پسِ دیوارِ زنداں

اپنی آہوں کا ستم گر پہ اثر ہونے تک
ہم کو جلنا ہے یونہی رات بسر ہونے تک
صرف سودا ہی ضروری نہیں دیوانوں میں
سر بھی درکار ہے دیوار کو سر ہونے تک

○

اے دوست رہِ زیست میں زنداں نہ رہیں گے
آئے گی سحر، لوگ پریشاں نہ رہیں گے

صیّاد کے ہم پنجۂ بیداد سے ڈر کر
تزئینِ گلستاں سے گریزاں نہ رہیں گے

ہم دہر میں انسان کی عظمت کا نشاں ہیں
ہم ہوں گے مگر دشمنِ انساں نہ رہیں گے

صدیوں کی سیہ رات ہے اب ڈھلنے پہ مجبور
اشکوں کے ستارے سرِ مژگاں نہ رہیں گے

ان قصر نشینوں سے ہے بیزار زمانہ
یہ میر و وزیر اور یہ سلطاں نہ رہیں گے

اِک راہ پہ مل کر ہمیں چلنے کی ہے بس دیر
کچھ لوگ نمایاں ہیں نمایاں نہ رہیں گے

اس دور کے ممتاز ادیبوں کو بتا دو
تاریخ میں شاہوں کے ثنا خواں نہ رہیں گے

"سرِ مقتل" کی ضبطی پر

مرے ہاتھ میں قلم ہے مرے ذہن میں اُجالا
مجھے کیا دبا سکے گا کوئی ظلمتوں کا پالا
مجھے فکرِ امنِ عالم تجھے اپنی ذات کا غم
میں طلوع ہو رہا ہوں تُو غروب ہونے والا

○

وہ کہہ رہے ہیں محبّت نہیں وطن سے مجھے
سکھا رہے ہیں محبّت مشین گن سے مجھے

میں بے شعور ہوں کہتا نہیں ستم کو کرم
یہی خطاب مِلا اُن کی انجمن سے مجھے

سپر جو بن کے بنے غاصبوں کے کام آئے
خدا بچائے رکھے ایسے علم و فن سے مجھے

—

○

کتنا سکوت ہے رسن و دار کی طرف
آتا ہے کون جرأتِ اظہار کی طرف

دشتِ وفا میں آبلہ پا کوئی اب نہیں
سب جا رہے ہیں سایۂ دیوار کی طرف

قصرِ شہی سے کہتے ہیں نکلے گا مہرِ نو
اہلِ خرد ہیں اس لیے سرکار کی طرف

دشنام و کوریا سے عدو کو نکال لیں
آئیں گے لوٹ کر لب و رخسار کی طرف

باقی جہاں میں رہ گیا غالب کا نام ہی
ہر چند اک ہجوم تھا اغیار کی طرف

—

صحافی سے

قوم کی بہتری کا چھوڑ خیال
فکرِ تعمیرِ مُلک دل سے نکال

تیرا پرچم ہے تیرا دستِ سوال
بے ضمیری کا اور کیا ہو مآل

اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

تنگ کر دے غریب پر یہ زمیں
خم ہی رکھ آستانِ زر پہ جبیں
عیب کا دَور ہے ہُنر کا نہیں
آج حُسنِ کمال کو ہے زوال

اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

کیوں یہاں صبحِ نو کی بات چلے
کیوں ستم کی سیاہ رات ڈھلے
سب برابر ہیں آسماں کے تلے
سب کو رجعت پسند کہہ کر ٹال
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

نام سے پیشتر لگا کے امیر
ہر مسلمان کو بنا کے فقیر
قصر و ایواں میں ہو قیام پذیر
اور خطبوں میں دے عمرؓ کی مثال
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

آمریت کی ہمنوائی میں
تیرا ہمسر نہیں خدائی میں
بادشاہوں کی رہنمائی میں
روز اسلام کا جلوس نکال
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

لاکھ ہونٹوں پہ دم ہمارا ہو
اور دل صبح کا ستارا ہو
سامنے موت کا نظّارا ہو
لکھ یہی ٹھیک ہے مریض کا حال
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

تیز چلو

یہ کہہ رہا ہے دلِ بیقرار تیز چلو
بہت اُداس ہیں زنجیر و دار تیز چلو

جو تھک گئے ہیں انھیں گردِ راہ رہنے دو
کسی کا اب نہ کرو انتظار تیز چلو

خزاں کی شام کہاں تک رہے گی سایہ فگن
بہت قریب ہے صبحِ بہار تیز چلو

تمھی سے خوفزدہ ہیں زمین و زرد الے
تمھی ہو چشمِ ستمگر پہ بار، تیز چلو

کرو خلوص و محبّت کو رہنما اپنا
نہیں درُست دلوں میں غبار تیز چلو

بہت ہیں ہم میں یہاں لوگ گفتگو پیشہ
ہے اُن کا صرف یہی کاروبار تیز چلو

خرد کی سُست روی سے کسے ملی منزل
جنوں ہی اب تو کرو اختیار تیز چلو

ہر اک شاخِ تمنّا جل رہی ہے
مری بندوق مجھ پر چل رہی ہے
اگر کہتے ہیں ہم قاتل کو قاتل
تو اُن کو بات یہ کیوں کھل رہی ہے

مرثیہ خاک نشیناں

جو اوجڑی میں مارا گیا بس وہ مرگیا
خاکی تھا اور خاک کی صُورت بکھر گیا
منشائے ایزدی کے مطابق گزر گیا
ہر بے گنہ کا خُون مقدّر کے سر گیا

چنگیز خان شہید ہلاکو شہید ہے
آیا جو اس زمیں پہ ڈاکو شہید ہے
جو اس نگر میں کر کے مرا کو شہید ہے

کاذب کے واسطے ہے ہر اک روز روزِ عید
کیا کیا نہ اہلِ صدق کی مٹی ہوئی پلید
نیچے شنید اِن کی نہ اُوپر ہی کچھ شنید
جو مر رہے ہیں سندھ میں ہرگز نہیں شہید

کہیے یہی یقیں سے شیطاں عظیم ہے
جو بھی ہے اس کے تابعِ فرماں عظیم ہے
یہ ایک واہمہ ہے کہ اِنساں عظیم ہے

ہر بوالہوس ہے معتبر و باوفا یہاں
ہر راہزن ہے راہبر و میرِ کارواں
ہر اہلِ زر ہے خاک نشینوں کا ترجماں
لوگ اپنے قاتلوں کے ہیں عُشّاق میری جاں

لبریز جام دُردِ تہِ جام کو لکھو
حُسنِ تمام بجھتی ہوئی شام کو لکھو
وجہِ نشاط نشترِ آلام کو لکھو

منشور

دے دیا سامراج نے منشور
رہیو بس اقتصادیات سے دُور
بات پچھلی بڑھائیو آگے
دائرے سے نہ جائیو آگے

اُٹھّو مرنے کا حق اِستعمال کرو

جینے کا حق سامراج نے چھین لیا
اُٹھّو مرنے کا حق استعمال کرو

ذلّت کے جینے سے مرنا بہتر ہے
مِٹ جاؤ یا قصرِ ستم پامال کرو

سامراج کے دوست ہمارے دشمن ہیں
اِنھی سے آنسو، آہیں آنگن آنگن ہیں
اِنھی سے قتلِ عام ہُوا آشاؤں کا
اِنھی سے ویراں اُمیدوں کا گلشن ہے

بھوک ننگ سب دین انہی کی ہے لوگو
بھول کے بھی مت ان سے عرضِ حال کرو
جینے کا حق سامراج نے چھین لیا
اُٹھو مرنے کا حق استعمال کرو

صبح و شام فلسطیں میں خوں بہتا ہے
سایۂ مرگ میں کب سے انساں رہتا ہے
بند کرو یہ باوردی غنڈہ گردی
بات یہ اب تو ایک زمانہ کہتا ہے
ظلم کے ہوتے امن کہاں ممکن یارو
اِسے مٹا کر جگ میں امن بحال کرو
جینے کا حق سامراج نے چھین لیا
اُٹھو مرنے کا حق استعمال کرو

سلام لوگو!

سلام اے دل فگار لوگو!
سلام اے اشکبار لوگو

تمھی نے اپنا وطن بچایا | تمھی نے باطل کا سر جھکایا
بجھا کے شمعِ حیات اپنی | وفا کی راہوں کو جگمگایا
مگر یہ دل رو کے کہہ رہا ہے | لہو تمھارا نہ رنگ لایا

وہی ہے شب کا حصار لوگو
سلام اے اشکبار لوگو

گلوں کی وادی لہو لہو ہے فغاں کی آواز چار سُو ہے

ہیں اس قدر تشنہ کام میکش ہر ایک لب پر سُبُو سُبُو ہے

نشانِ منزل ہے کھویا کھویا لُٹا لُٹا شہرِ آرزو ہے

بُجھے بُجھے ہیں دیار لوگو!

سلام اے اشکبار لوگو!

تمھارے دم سے ہری زمینیں خوشی سے دامن بھری مشینیں

ہیں اس کے باوصف بھیگی بھیگی تمھاری اشکوں سے آستینیں

میں سوچتا ہوں رہیں گی کب تک ستم کے آگے جُھکی جبینیں

اُٹھاؤ سر سوگوار لوگو!

سلام اے اشکبار لوگو!

———

○

جدھر نگاہ اُٹھائیں کھلے کنول دیکھیں
غزل کہیں کہ مری جان ہم غزل دیکھیں

خیالِ مرگِ وفا نے بچا لیا ہم کو
کہا جو دل نے کبھی راستہ بدل دیکھیں

کیے ہوئے ہیں دل و جاں نثار ہم جن پر
چلو کہ چل کے وہی کوچۂ اجل دیکھیں

وہی جمال وہی تمکنت وہی اعجاز
ہزار پل اُسے دیکھیں کہ ایک پل دیکھیں

قدم قدم پہ لُٹے ہیں جو لوگ اے جالبؔ
رہِ طلب میں ہمارے بھی ساتھ چل دیکھیں

(یہ غزل لندن میں قیام کے دوران کہی گئی)

آرمینیا کے لوگوں کا نوحہ

ہنستے گاتے آنگنوں کو زلزلے نے آلیا
چاند سے چہروں کو مرگِ ناگہاں نے کھالیا

جن پہ گزرا ہے یہ عالم اُن کا غم ہوگا نہ کم
اپنے دل کو کر کے ہم نے شاعری بہلالیا

پھول سے بچوّں کا مائیں کر رہی تھیں انتظار
گھر نہ لوٹے ہائے گورستاں کا رستہ لیا

ہوگیا اک آن میں ویران پریوں کا دیار
آسماں تُو نے زمیں سے کون سا بدلہ لیا

جاں لیوا آفتوں پر فتح پائی ہے ابھی
کون کہتا ہے کہ ہم نے منزلوں کو پالیا

○

زندہ ہیں ایک عمر سے دہشت کے سائے میں
دم گھٹ رہا ہے اہلِ عبادت کے سائے میں

بچھڑے ہوئے دیارِ دل و جاں کے ساکنو
پُوچھو نہ دُکھ سہے ہیں جو غربت کے سائے میں

اے رہروانِ راہِ سحر داد دو ہمیں
لیتے ہیں سانس ظلم کی ظلمت کے سائے میں

ہم آئیں گے تو آئے گا وہ عہدِ خوشگوار
گزرے گی جب حیات محبّت کے سائے میں

دادا امیر حیدر

نہیں ہے کوئی بھی داغِ سجدہ تری جبیں پر
ڈٹا رہا عرصۂ وفا میں تُو زندگی بھر
کھڑے ساحل پہ ہم سمندر کا تُو شناور
میں اپنی عزت بڑھا رہا ہوں ترے لیے چند شعر کہہ کر
عظیم دادا امیر حیدر عظیم دادا امیر حیدر

عذاب ہے اپنی سادہ لوحی
لبوں پہ رہتی ہے بات دل کی
زمانہ کہتا ہے اُس کو مانوں
نہیں جھلک جس میں کوئی تیری

منافقوں میں گھرا ہُوا ہوں
کدھر سے نکلوں میں ان سے بچ کر

عظیم دادا امیر حیدر عظیم دادا امیر حیدر

زبان و دل مختلف نہیں ہیں
کہا جو تُو نے وہی کیا ہے
کہاں کوئی اس طرح جیا ہے
کہاں کوئی باضمیر تجھ سا
تُو وہ نَوا ہے دبا نہ پایا
جسے جہاں میں کوئی ستمگر

عظیم دادا امیر حیدر عظیم دادا امیر حیدر

○

کراہتے ہوئے انسان کی صدا ہم ہیں
میں سوچتا ہوں مری جان اور کیا ہم ہیں

جو آج تک نہیں پہنچی خدا کے کانوں تک
سرِ دیارِ ستم آہِ نارسا ہم ہیں

تباہیوں کو مقدّر سمجھ کے ہیں خاموش
ہمارا غم نہ کرو دردِ لادوا ہم ہیں

کہاں نگہ سے گزرتے ہیں دُکھ بھرے دیہات
حسین شہروں کے ہی غم میں مبتلا ہم ہیں

بیان تنگ ہے تنگ دو بیاں چھپ جائے
کہ آمرانہ قوانین سے خفا ہم ہیں

ازل سے سلب ہیں جالب حقوقِ انسانی
نظر جُھکائے ہوئے مائلِ دُعا ہم ہیں

کسے خبر تھی ہمیں راہبر ہی لُوٹیں گے
بڑے خلوص سے ہم کارواں کے ساتھ رہے

ولی خاں

مرے کارواں میں شامل کوئی کم نظر نہیں ہے
جو نہ مٹ سکے وطن پر میرا ہمسفر نہیں ہے
درِ غیر پر ہمیشہ تمھیں سر جھکائے دیکھا
کوئی ایسا داغِ سجدہ مرے نام پر نہیں ہے
کسی سنگدل کے در پر مرا سر نہ جُھک سکے گا
مرا سر نہیں رہے گا مجھے اس کا ڈر نہیں ہے

O

لوگوں ہی کا خوں بہہ جاتا ہے ہوتا نہیں کچھ سلطانوں کو
طوفاں بھی نہیں زحمت دیتے ان کے سنگیں ایوانوں کو

ہر روز قیامت ڈھاتے ہیں تیرے بے بس انسانوں پر
اے خالقِ انساں تو سمجھا اپنے خونی انسانوں کو

دیواروں میں سہمے بیٹھے ہیں کیا خوب ملی ہے آزادی
اپنوں نے بہایا خوں اِتنا، ہم بھول گئے بیگانوں کو

اِک اِک پل ہم پر بھاری ہے دہشت تقدیر ہماری ہے
گھر میں بھی نہیں محفوظ کوئی باہر بھی ہے خطرہ جانوں کو

غم اپنا بُھلائیں جا کے کہاں ہم ہیں اور شہرِ آہ و فغاں
ہیں شام سے پہلے لوگ رواں اپنے اپنے غم خانوں کو

نکلیں کہ نہ نکلیں ان کی رضا بندوق ہے اُنکے ہاتھوں میں
سادہ تھے بزرگ اپنے جالبؔ گھر سونپ گئے دربانوں کو

میرا جی

گیت کیا کیا لکھ گیا، کیا کیا فسانے کہہ گیا
نام یُونہی تو نہیں اُس کا ادب میں رہ گیا

ایک تنہائی رہی اُس کی انیسِ زندگی
کون جانے کیسے کیسے دُکھ وہ تنہا سہہ گیا

سوز میرا کا مِلا جی کو تو میرا جی بنا
دلنشیں لِکھّے سخن اور دھڑکنوں میں رہ گیا

درد جِتنا بھی اُسے بے درد دُنیا سے مِلا
شاعری میں ڈھل گیا کچھ آنسوؤں میں بہہ گیا

اک نئی چھب سے جیا وہ اِک عجب ڈھب سے جیا
آنکھ اُٹھا کر جس نے دیکھا دیکھتا ہی رہ گیا

اُس سے آگے کوئی بھی جانے نہیں پایا ابھی
نقش بن کے رہ گیا جو اُس کی رو میں بہہ گیا

مرا قصور کہ میں ان کے ساتھ چل نہ سکا
وہ تیز گام مرا انتظار کیوں کرتے

O

بھیگیں نہ آنسوؤں سے کنارے سویز کے
بہتے رہیں سکون سے دھارے سویز کے

بُجھنے نہ پائے موجِ ہوائے یہود سے
اِک جوت جگ رہی ہے سہارے سویز کے

دائم فضا میں پرچم نصرت رہے بُلند
موتی یُونہی لُٹائیں نظارے سویز کے

عُقبیٰ کا ہے خیال تو عقبہ کا ساتھ دو
ٹوٹے ہوئے دلوں کی تمنّا کا ساتھ دو

ناطہ ہر ایک توڑ کے افرنگیوں سے آج
خود دار ہو تو مشرقِ وسطیٰ کا ساتھ دو

مغرب کے راہزن کا جنوں پھر ہے جوش پر
گر امن چاہتے ہو تو دُنیا کا ساتھ دو

مادرِ ملّت

اب رہیں چین سے بے درد زمانے والے
سو گئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

دیکھنے کو تو ہزاروں ہیں مگر کتنے ہیں
ظُلم کے آگے کبھی سر نہ جھکانے والے

مر کے بھی مرتے ہیں کب مادرِ ملّت کی طرح
شمع تاریک فضاؤں میں جلانے والے

اکتوبر انقلاب

اِس انقلاب سے اِنساں کا بول بالا ہُوا
اِس انقلاب سے کٹیاؤں میں اُجالا ہُوا
اِس انقلاب کا دن اس لیے مناتے ہیں
تمام رنج و اَلم شب کے بُھول جاتے ہیں
اِس انقلاب سے محنت کشوں کا راج آیا
اِس انقلاب سے انصاف کا سماج آیا
جب اس کے رنگ نگاہوں میں مسکراتے ہیں
تمام رنج و اَلم شب کے بُھول جاتے ہیں
اِس انقلاب نے تقدیر کو پچھاڑ دیا
ہر ایک جبر کی بُنیاد کو اُکھاڑ دیا

ہم اس کے دیپ خیالوں میں جب جلاتے ہیں
تمام رنج و اَلم شب کے بھُول جاتے ہیں
اِس انقلاب کی پیغامبر ہوائیں ہیں
اِس انقلاب کی باہوں میں یہ فضائیں ہیں
اِس انقلاب کے جب خواب ہم سجاتے ہیں
تمام رنج و اَلم شب کے بھُول جاتے ہیں

میں بھی تری طرح سے آوارہ و بیکار
اُڑتے ہوئے پتّے مجھے ہمراہ لیے چل

○

اجنبی دیاروں میں پھر رہے ہیں آوارہ
اے غمِ جہاں تُو نے یہ بھی دن دکھائے ہیں

تیرے بام و دَر سے دُور تیری رہگزر سے دُور
رات کی سیاہی ہے تیرگی کے سائے ہیں

اُس نگاہ سے جالبؔ رسم و راہ کی خاطر
ہم نے کم نگاہوں کے ناز بھی اُٹھائے ہیں

اے اہلِ عرب اے اہلِ جہاں

اے اہلِ عرب اے اہلِ جہاں
ریگن کا مٹا دو نام و نشاں
انصاف ہے جس سے اشک فشاں
سچ جس کی طبیعت پہ ہے گراں
جو بولتا ہے نفرت کی زباں
جو بانٹتا ہے آہوں کا دھواں
خطرے میں ہیں جس سے دیدہ وراں
اس دہر میں امن کا ہر امکاں
اے اہلِ عرب اے اہلِ جہاں

ورنہ وہ مٹا دے گا تم کو

مٹی میں ملا دے گا تم کو

کچھ ایسی فضا دے گا تم کو

ظُلمت میں چھپا دے گا تم کو

جینا ہی بُھلا دے گا تم کو

رِفعت سے گرا دے گا تم کو

پاؤ گے یہ سُورج چاند کہاں

اے اہلِ عرب اے اہلِ جہاں

ہر آمر کا یہ حامی ہے

کب اس کی سوچ عوامی ہے

چہردیس اس کی بدنامی ہے

تقدیر اس کی ناکامی ہے

دہشت میں بڑا ہی نامی ہے

پختہ اس کی یہ خامی ہے

ہے زہر بھرا اس کا بیاں

اے اہلِ عرب اے اہلِ جہاں

انسان کی شان قذافی ہے

عالم کی آن قذافی ہے

اپنا دل جان قذافی ہے

جیون مُسکان قذافی ہے

سچ کی پہچان قذافی ہے

سچ کی برہان قذافی ہے

اِس جیسا بنو مردِ میداں

اے اہلِ عرب اے اہلِ جہاں

رنگین کا مٹا دو نام ونشاں

○

شہر سے بستی سے ویرانے سے جی گھبرا گیا
اے جنوں تیرے ہر افسانے سے جی گھبرا گیا

اِک مکمل خامشی اِک بیکراں گہرا سکوت
آج صحرا کا بھی دیوانے سے جی گھبرا گیا

پھر گئے جا لب نگاہوں میں کئی اُجڑے چمن
موسم گل کا خیال آنے سے جی گھبرا گیا

—

اِجرائے مُساوات

دِل تھا مرا پہلے ہی سے شیدائے مساوات
پھر کیسے پسند آئے نہ اِجرائے مساوات

خونخوار لیٹروں سے ہو آزاد یہ دھرتی
اِس دیس میں اللہ کرے آئے مساوات

ہر آمر و فرعون کو آئینہ دکھائے
لوگوں کا ہو لوگوں سے نہ شرمائے مساوات

احساں نہ اُٹھائے کسی سُلطان کا جالبؔ
منت کشِ امریکہ نہ کہلائے مساوات

مادرِ ملّت کی پہلی برسی پر

بجا کہ دار و رسن ہیں صلہ صداقت کا
نہ رُک سکے گا مگر قافلہ صداقت کا
نہ ختم ہو گا کبھی سلسلہ صداقت کا
کہ آگ میں بھی گلستاں کِھلا صداقت کا
ہوئی شکست نہ ہو گی کبھی اُصولوں کو
بقا ملی ہے سدا امن کے رسولوں کو

ہے آج سارے وطن کی زباں پہ نام اُس کا
وہ مر گئی ہے مگر زندہ ہے پیام اُس کا
یونہی رہے گا ہر اِک دل میں احترام اُس کا
بلند رکھیں گے پرچم سدا عوام اُس کا
نشاں تمہارا نہ ہوگا ذرا مرد تو سہی
فرازِ جاہ سے نیچے قدم دھرو تو سہی

وہ نقشِ قائدِ اعظمؒ اُبھارنے آئی
وہ رنگ روئے گلستاں نکھارنے آئی
مقدّر اہلِ وطن کا سنوارنے آئی
وہ اپنی جان غریبوں پہ وارنے آئی
اُسے نہ جاہ و زر و مال کی ضرورت تھی
فقط عوام کے اقبال کی ضرورت تھی

اُٹھی عوام کو ہر گام پر جگاتی ہوئی
ہر اِک نگاہ میں شمعِ یقیں جلاتی ہوئی
غرورِ کج کلہاں خاک میں ملاتی ہوئی
پیام سب کو مساوات کا سناتی ہوئی
تھا اُس کا نعرہ کہ ہے ذات سے وطن پہلے
صدا یہ گونج اُٹھی آمروں کے دل دہلے

وطن کے حاکمِ اعلیٰ ہیں دس کروڑ انساں
یہ کہہ کے بخش دی اُس نے خموشیوں کو زباں
دل و نگاہ میں عزم و عمل کا تھا طوفاں
علم اٹھائے نکل آئے رن میں پیر و جواں
اِدھر جبین تھے اُدھر تھیں شمشیریں
کٹی نہیں تو کٹیں کی ضرور زنجیریں

ملّوں کے مالکو اے افسرو زمیندارو
ہماری راہِ ترقّی میں کالی دیوارو
کرو گے ہم یہ ستم کب تک ستم گارو
ہو چند روز ہی تم سیم و زر کے بیمارو
نشاں یزید کا باقی ہے اور نہ زار کا ہے
یہ دور اصل میں انسان کے وقار کا ہے

غلام ہم کو بنائے رہو گے تم کب تک
ہمارے سر کو جھکائے رہو گے تم کب تک
ہمارے حق کو دبائے رہو گے تم کب تک
وطن کو سُولی چڑھائے رہو گے تم کب تک
اندھیرا ظلم و ستم کا مٹا کے چھوڑیں گے
چراغِ مادرِ ملّت جلا کے چھوڑیں گے

—

ان دنوں کراچی کی جو صورت حال ہے اس کے بارے میں حبیب جالب نے کل لاہور سے ٹیلی فون پر ایڈیٹر امن سے گفتگو کے دوران اپنے منظوم تاثرات قلم بند کرائے جو نذرِ قارئین کیے جا رہے ہیں

میرے ہمدم مرے پیارے افضل

صورتِ حال سے دل ہے بے کل

تیری گلیوں پہ لگی ہیں نظریں

اور ترے شہر کا غم ہے ہر پل

در و دیوار ہیں سہمے سہمے

چہرۂ زیست ہے اوجھل اوجھل

بادو باراں بھی ہے زخمی زخمی

اشک آلود ہے آنچل آنچل

کوئی منظر نہیں اچھا لگتا

دل جلاتے ہیں گزرتے بادل

ہم نے شاداب فضا مانگی تھی!
اور ملی رنج و اَلم کی دلدل
قاتلِ امن و سکوں چین سے ہے
اپنے سینے میں مچی ہے ہلچل
آج اندازہ نہیں ہے ہم کو
آفتیں ڈھائے گی ہم پر کیا کل
ہم پہ چڑھ دوڑیں گے جیالے پہلوان
ماند پڑ جائیں گے اپنے کس بَل
بیٹھ جائیں گے دُبک کر سارے
یوں نکل جائے گا اپنا ہر بَل
ٹینک اذہان پہ چھا جائیں گے
اور کہیں گے ہمیں پاگل پاگل

(۱۱ر ستمبر ۱۹۸۷ء)

نُورجہاں

ہجومِ یاس میں جوت آس کی تری آواز
ہم اہلِ درد کی ہے زندگی تری آواز

لبوں پہ کھلتے رہیں پھول شعر و نغمہ کے
فضا میں رنگ بکھیرے یونہی تری آواز

دیارِ دیدہ و دل میں ہے روشنی تجھ سے
ہے چہرہ چاند مدھر چاندنی تری آواز

ہو ناز کیوں نہ مقدّر پہ اپنے نُورجہاں
تجھے قریب سے دیکھا سُنی تری آواز

نہ مٹ سکے گا ترا نام رہتی دُنیا تک
رہے گی یُوں ہی سدا گونجتی تری آواز

O

اُٹھ گیا ہے دلوں سے پیار یہاں
کتنے بے نُور ہیں دیار یہاں

روشنی روشنی، حیات حیات
ہر طرف ہے یہی پکار یہاں

راستہ کیا سجھائی دے اے دوست
جہل ہے شمعِ رہگزار یہاں

—

ترانۂ دوستی

پاک روس دوستی زندگی زندگی
پاک روس دوستی روشنی روشنی
پاک روس دوستی زندہ باد

چھٹے گی جان جنگ سے بچیں گے بھوک ننگ سے
کھلے گا چہرۂ وطن محبّتوں کے رنگ سے
ہوا کے انگ انگ میں بجیں گے جلترنگ سے
منتظر ہے دیر سے یہ زمین امن کی

پاک روس دوستی زندگی زندگی
پاک روس دوستی روشنی روشنی
پاک روس دوستی زندہ باد

نہ آئے گا کہیں نظر   عدوئے جاں نظامِ زر
رہیں گے دُور خوف سے   ہمارے گھر ہمارے دَر
جیئے گا عزّ و شان سے   مرے وطن کا ہر بشر
رہ نہ پائے گی یہاں   بے کسی و مُفلسی

پاک روس دوستی زندگی زندگی
پاک روس دوستی زندہ باد
پاک روس دوستی زندہ باد

نہ لُٹ سکیں گی محنتیں   نہ بِک سکیں گی حسرتیں
امیر اس دیار کے   نہ دے سکیں گے ذلّتیں
نصیب میں یہ سنگدل   نہ لکھ سکیں گے ظُلمتیں
دیکھنا ستم زدو   غم کی رات اب ڈھلی

پاک روس دوستی زندگی زندگی
پاک روس دوستی روشنی روشنی
پاک روس دوستی زندہ باد

O

نہ کلیوں میں رنگت نہ پھولوں میں باس
بہار آئی پہنے خزاں کا لباس

گھنی چھاؤں ہے دو گھڑی بیٹھ لو
کڑی دھوپ میں جاؤ گے کس کے پاس

ستارو یونہی جگمگاتے رہو
رفیقو کہیں ٹوٹ جائے نہ آس

امریکہ نہ جا

کر کے نذرِ گردشِ حالات امریکہ نہ جا
کیسے پورے ہوں گے اخراجات امریکہ نہ جا

بس لڑائے رکھ یونہی جانِ جہاں ہمساؤں سے
بس بنائے رکھ ہماری بات امریکہ نہ جا

تیرے جانے سے تو جاں ہو جائیں گے برباد ہم
دے کے اشکوں کی ہمیں برسات امریکہ نہ جا

خاک میں مل جائیں گے سارے ہمارے کرّوفر
لوگ بیٹھے ہیں لگائے گھات امریکہ نہ جا

تیرے ہی لطف و کرم سے ہے ہماری زندگی
کرکے کم جینے کے امکانات امریکہ نہ جا

ایک پنڈی شہر کیا تجھ پر نچھاور پورا ملک
بھیجتا رہ آتشیں آفات امریکہ نہ جا

کاخِ زرّیں تجھ سے ہے تیری بدولت تخت و تاج
تجھ سے قائم ہے ہماری ذات امریکہ نہ جا

تُو ہی بتلا کس طرح پالیں گے اتنی فوج کو
جوڑتے ہیں تیرے آگے ہاتھ امریکہ نہ جا

○

حُسن کا ہم نے کیا چرچا بہت
حُسن کے ہاتھوں ہُوئے رُسوا بہت

موجِ نکہت اپنی قسمت میں نہ تھی
دُور سے اُس پھُول کو دیکھا بہت

وہ ملا تھا راہ میں اک شام کو
پھر اُسے میں نے یہاں ڈھونڈا بہت

———

اے مُدبرِ امن

اے مدبرِ امن تیرے شہر کو کیا ہوگیا
بُجھ گئے بازار گلیوں میں اندھیرا ہوگیا

اِس دبستانِ ادب کو کھا گئی کس کی نظر
دیکھتے ہی دیکھتے اِک حشر برپا ہوگیا

ہوگئی دُنیا ہماری اور بھی بے آسرا
اور بھی ہم بے کسوں کا خُون سستا ہوگیا

زندگی کے لب پہ آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سسکیاں لینے لگے سُر قتلِ نغمہ ہوگیا

(۲۴ جولائی ۱۹۸۷ء)

حسن ناصر

ترا لہو ہمیں دیتا ہے یہ پیام کہ ہم
تمام دہر میں لہرائیں امن کا پرچم
تجھے نظر میں رکھیں تیرے راستے پہ چلیں
سرِ زمانہ کریں سامراج کا سر خم

نہ تجھ کو اور نہ تری سوچ کو بھلائیں گے
ترے خیال و نظر کی قسم حسن ناصر
ترے خیال و نظر کے دیے جلائیں گے

یہ رہزنوں کی حکومت نئی نہیں یارو
ہر ایک چہرے سے پردہ ہمیں اُٹھانا ہے
ہماری جنگ رہی ہے رہے گی باطل سے
ہمیں دوام ہے ہم کو جہاں پہ چھانا ہے

ہم آ رہے ہیں ہم آئیں گے ہم ہی آئیں گے
ترے خیال و نظر کی قسم حسن ناصر
ترے خیال و نظر کے دیئے جلائیں گے

○

درد کی دُھوپ ہے خوف کے سائے ہیں
اپنی منزل تھی کیا اور کہاں آئے ہیں

دل تھا پہلے ہی چھلنی غمِ دہر سے
زخم تیری جُدائی کے بھی کھائے ہیں

سب کو فکرِ گریباں ہے اِس عہد میں
ایک اہلِ جنوں ہم ہی کہلائے ہیں

———

ہم لڑیں امریکیوں کی جنگ کیوں
اور کریں اپنی زمیں خُوں رنگ کیوں

روشنی کے ہم تو خود ہیں منتظر
روشنی پر ہم اُٹھائیں سنگ کیوں

اے ستم گر تُو نے سوچا ہے کبھی
تجھ سے ہے ساری خدائی تنگ کیوں

امن و آزادی کے ہم تو ہیں نقیب
ہوں کسی غاصب سے ہم آہنگ کیوں

کوٹ لکھپت جیل

قصوری قید اسلم قید خورشید و عمر قیدی
مری جاں اس خراب آباد میں ہے ہر بشر قیدی

سلاخوں میں اُدھر ہے طاہرہ اور اس طرف مظہر
بنا رکھا ہے اِک بیداد گر نے گھر کا گھر قیدی

حمید اختر بھی ہے رحمٰن بھی ہے اور مُغل بھی ہے
مقدر سے ملے ہیں واہ کیا کیا دیدہ ور قیدی

جہالت پھر رہی ہے شہر میں آزاد و آوارہ
رضا کاظم، مبشر راؤ منت اور ظفر قیدی

علی سا خُوبرو فن کار بھی قیدِ نفس میں ہے
بہت مسرور ہوتے ہیں اسے سب دیکھ کر قیدی

شعیبؔ ہاشمی زنداں میں پہلی بار آیا ہے
وطن میں رہ چکا ہے مدّتوں اس کا خُسر قیدی

میں آیا ہوں تو اپنے ساتھ نوحہ گر بھی لایا ہوں
مری صورت ہے اس زنداں میں میرا پبلشر قیدی

ملکؔ ہیرا رؤفؔ احسانؔ مہدیؔ چودھریؔ اصغرؔ
یہ ساتھی ہوں تو رہ سکتا ہے انساں عُمر بھر قیدی

یہ اُبھریں گے یہ چمکیں گے یہ ظُلمت کو مٹا دیں گے
زیادہ دیر رہ سکتے نہیں شمس و قمر قیدی

ہمارے ساتھ عبداللہؔ[1] بھی ہیں اور اِک ججؔ[2] بھی
رہے ہیں جن کے کیا کیا اہلِ دل اہلِ نظر قیدی

[1] عبداللہ ملک
[2] ملک سعید حسن

ولیؔ یعقوبؔ استقلالؔ تاج الدینؔ اور عابدؔ
یہ کر لیتے ہیں دل بس میں بڑے ہیں جادوگر قیدی

بہت کمیاب ہیں فیاضؔ سے انسان دُنیا میں
ثناخواں ان کا زِنداں میں ہے میری جان ہر قیدی

کہاں ملتے ہیں صبح و شام زندانوں میں اے ہمدم
رشیدؔ و صفدر و مشتاق ایسے باخبر قیدی

یہ سب رونق ہے پاہٹؔ ہی کے دم سے کوٹ لکھپت میں
نہ ہو یہ تو نکل جائیں سلاخیں توڑ کر قیدی

لگا ہے کوٹ لکھپت جیل میں میلہ چراغاں کا
کہاں ہے قیدِ تنہائی اِدھر قیدی اُدھر قیدی

وہ آیا لے کے ہونٹوں پہ ہنسی خان اے حمیدؔ آیا
وہ آیا میرے بچھڑے دیس کا نُورِ نظر قیدی

؎ داروغۂ مطبخ

ضرورت ڈاکٹر بنگش کی تھی تو وہ بھی آپہنچا
کرے گا دیکھ بھال اب قیدیوں کی ڈاکٹر قیدی

بڑا انساں ہے اپنے وقت کا یہ بھی قلندر ہے
قفس میں پھر رہا ہے جو مُنڈائے اپنا سر قیدی

کنیزِ فاطمہ، محمود، ملٹو اعتزاز احسن
یہ قیدی ہیں کہ ہے اِک علم و دانش کا نگر قیدی

بشیر[1] و حامد[2] و محمود[3] ہیں بکھرے ہوئے موتی
کوئی قیدی کدھر ہے اور ہے کوئی کدھر قیدی

یہ قاسم اور قاضی حسیٰ تو قیدی پُرانے تھے
بنے ہیں خواجہ خیرالدین ڈھاکہ چھوڑ کر قیدی

[1] بشیر ظفر [2] میاں محمود احمد [3] حامد محمود مرحوم

ملک قاسم بھی اصغر خان بھی ہیں ملک کے دشمن
میاں ہم کیا ہیں خیر الدین بھی ہیں اہلِ شر قیدی

نہ کچھ ارشاد فرمایا نہ کوئی راہ دکھلائی
اِدھر ٹوپی جمی سر پر ہوئے بس ہم ادھر قیدی

میاں معراج و اصغر خاں کا بس اتنا فسانہ ہے
پڑا ہے کوئی زنداں میں تو کوئی اپنے گھر قیدی

اٹھا لے لاکھ دیواریں مقابل مہرِ تاباں کے
ستم گر ہو بھی سکتی ہے کبھی شب کی سحر قیدی

یہ قیصر مصطفےٰ اسرار یہ انور رشید اپنے
سلاخوں میں پڑے ہیں دیکھ کیا کیا شیر نر قیدی

لہ اشارہ نوابزادہ نصر اللہ خاں کی طرف ہے۔

میں دیکھوں تو کسے دیکھوں میں رؤوں تو کسے رؤوں
مرے قلب و نظر قیدی مرے جان و جگر قیدی

کسی کی کچھ خبر ملتی نہیں ہے اس زمانے میں
نجانے اور کتنے ہیں ہمارے ہم سفر قیدی

نہیں پُرساں کوئی اُن کا پڑے ہیں جیل خانوں میں
ہوا کرتے تھے ہم سے لوگ جن کے حکم پر قیدی

نہ یہ زنداں رہیں باقی نہ یہ ظلم و ستم جالبؔ
اکٹھے ہو کے دھاوا بول دیں سارے اگر قیدی

ہم اُن نجوم کی تابش بھی چھین سکتے ہیں
بنا دیا ہے جنھیں فخرِ آسماں ہم نے

بیٹھا ہے

اثر اُس پر نہیں کچھ بھی یُونہی وہ تن کے بیٹھا ہے
خدائی ساری کافر ہے وہ مومن بن کے بیٹھا ہے
وطن آدھا گیا آدھا پریشانی کی زد میں ہے
نہیں پروا اُسے اِس کی بغیر اُلجھن کے بیٹھا ہے

وہ ہوگئے وزیر

وہ ہوگئے وزیر شبِ غم گزر گئی
غربت زدہ عوام کی قسمت سنور گئی
اب اُن کی گفتگو میں تحمّل کی لہر ہے
جالب اب اُن کے جوش کی ندّی اُتر گئی

قطعات

مری نگاہ سے وہ دیکھتے رہے ہیں مجھے
رہا ہوں میں بھی کبھی اُس نگاہ کا معیار
یہاں نہ تلخ نوائی سے کام لو جالب
رہینِ درد نہیں ہیں یہ بستیاں، یہ دیار

ابھی اے دوست ذوقِ شاعری ہے وجہِ رُسوائی
تری بستی میں ہم پر اور بھی الزام آئیں گے
اگر اب بھی ہمارا ساتھ تُو اے دل نہیں دے گا
تو ہم اس شہر میں تجھ کو اکیلا چھوڑ جائیں گے

اشک آنکھوں میں اب ہیں آئے سے
بات چھپتی نہیں چھپائے سے
اپنی باتیں کہیں تو کس سے کہیں
سب یہاں لوگ ہیں پرائے سے

نت نئے شہر نت نئی دُنیا
ہم کو آوارگی سے پیار رہا
اُن کے آنے کے بعد بھی جالب
دیر تک اُن کا انتظار رہا

زُلف کی بات کیے جاتے ہیں
دن کو یُوں رات کیے جاتے ہیں
چند آنسو ہیں، انھیں بھی جالب
نذرِ حالات کیے جاتے ہیں

دیارِ سبزہ و گُل سے نکل کر
دل و جاں نذرِ صحرا ہو گئے ہیں
کہاں وہ چاند سی ہنستی جبینیں
گھنی تاریکیوں میں کھو گئے ہیں

مدّتیں ہو گئیں خط کرتے
شرم آتی ہے اب دُعا کرتے
چاند تارے بھی اُن کا اے جالبؔ
تھرتھراتے ہیں سامنا کرتے

حبیب جالب فلم نگر میں

آج اِس شہر میں کل نئے شہر میں بس اِسی لہر میں
اُڑتے پتّوں کے پیچھے اُڑاتا رہا شوقِ آوارگی

میرے شانوں پہ زُلفوں کو لہراؤ گے، میرے کہلاؤ گے
یوں خیالوں کی دُنیا بساتا رہا
اُڑتے پتّوں کے پیچھے اُڑاتا رہا
شوقِ آوارگی

یوں ادا ہم نے فرضِ محبّت کیا ، آنسوؤں کو پیا
زخم کھاتا رہا مُسکراتا رہا
اُڑتے پتّوں کے پیچھے اُڑاتا رہا
شوقِ آوارگی

اُس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے، فتنہ گر لوگ تھے
ہائے کیوں دل کی دولت لُٹاتا رہا
اُڑتے پتّوں کے پیچھے اُڑاتا رہا
شوقِ آوارگی

فلم : جوکر　　موسیقار مصلح الدین　　گلوکار : احمد رُشدی

دے گا نہ کوئی سہارا

اِن بے درد فضاؤں میں

سو جا غم کی چھاؤں میں

اپنا دُکھ ہے جیون بھر کا

پَل کی بات نہیں ہے

رونے سے جو کٹ جائے یہ

ایسی رات نہیں ہے

رحم نہیں ہے اس نگری کی ہواؤں میں

سو جا غم کی چھاؤں میں

آج اگر اپنی ماں ہوتی، گود میں لے کر سوتی

ننھے ننھے تیرے آنسو دیکھ کے کتنا روتی

بکھرے ہیں کانٹے پھول سے تیرے پاؤں میں

سو جا غم کی چھاؤں میں

فلم: کون کسی کا　　موسیقار: منظور اشرف　　گلوکارہ: نسیم بیگم، آئرن پروین

تُو کہ ناواقفِ آدابِ غلامی ہے ابھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

آج قاتل کی یہ مرضی ہے کہ سرکش لڑکی
سرِمقتل تجھے کوڑوں سے نچایا جائے
موت کا رقص زمانے کو دکھایا جائے
اِس طرح ظُلم کو نذرانہ دیا جاتا ہے
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

دیکھ فریاد نہ کر، سر نہ جھکا پاؤں اُٹھا
کل کو جو لوگ کریں گے تُو ابھی سے کر جا
ناچتے ناچتے آزادی کی خاطر مر جا
منزلِ عشق میں مر مر کے جیا جاتا ہے
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

فلم زرقا　　　موسیقار: رشید عطرے　　　گلوکار: مہدی حسن

○

یہ اعجاز ہے حُسن آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

ملے تجھے بہت ہمسفر زندگی میں
نہیں یاد کس کو کہاں چھوڑ آئے

بہت مہرباں تھیں وہ گلپوش راہیں
مگر ہم انھیں مہرباں چھوڑ آئے

ہر اک شب کسی زُلف کے میہماں تھے
مہکتی گھٹا وہ سماں چھوڑ آئے

جو دامن پہ آئیں تو ہو جائیں رُسوا
کچھ ایسے بھی اشکِ رواں چھوڑ آئے

فلم: سماج　　موسیقار: اے حمید　　گلوکار: مہدی حسن

○

مرے دل کی انجمن میں ترے غم سے روشنی ہے
نہ بُھلا سکوں گا تجھ کو ترا پیار زندگی ہے

تری محفلیں سجا کے، چلے ہر خوشی لُٹا کے
ہیں یہی صلے وفا کے، یہی رسمِ عاشقی ہے

تری رہگزر سے آگے مرا دل نہ جا سکے گا
مجھے گردشِ زمانہ کہاں لے کے جا رہی ہے

تُو سدا رہے سلامت مجھے بُھول جانے والے
کہ تری خوشی کے قرُباں مرے دل کی ہر خوشی ہے

فلم : قیدی　　موسیقار: رشید عطرے　　گلوکار: سلیم رضا

تن توپے واروں

من توپے واروں

بگڑی بنا دے

توہے رو رو پکاروں

پریت کا ناتا ٹوٹ نہ جائے

جیون مجھ سے روٹھ نہ جائے

پیا سے ملا دے موری بگڑی بنا دے

تن توپے واروں

رو رو نیناں ہار نہ جائیں

طعنے جگ کے مار نہ جائیں

بھاگ جگا دے، موری بگڑی بنا دے

تن تو پے واروں

آس نراشں میں ڈھلنے لگی ہے

من کی بگیا جلنے لگی ہے

آگ بجھا دے، موری بگڑی بنا دے

تن تو پے واروں

فلم : ناگ منی　　موسیقار : نثار بزمی　　گلوکارہ : نور جہاں

ظُلم رہے اور امن بھی ہو
کیا ممکن ہے تم ہی کہو

ہنستی گاتی ، روشن وادی
تاریکی میں ڈوب گئی

بیتے دن کی لاش پہ اے دل
میں روتا ہوں تُو بھی رو

ظُلم رہے اور امن بھی ہو

ہر دھڑکن پر خوف کے پہرے
ہر آنسو پر پابندی!
یہ جیون بھی کیا جیون ہے
آگ لگے اس جیون کو
ظلم رہے اور امن بھی ہو

اپنے ہونٹ سیئے ہیں تم نے
میری زباں کو مت روکو
تم کو اگر توفیق نہیں تو
مجھ کو ہی سچ کہنے دو
ظُلم رہے اور امن بھی ہو

فلم: یہ امن　　موسیقار: اے حمید　　گلوکار: مہدی حسن، نورجہاں

اِس درد کی دُنیا سے گزر کیوں نہیں جاتے
یہ لوگ بھی کیا لوگ ہیں مر کیوں نہیں جاتے

ہے کون زمانے میں مرا پوچھنے والا
ناداں ہیں جو کہتے ہیں کہ گھر کیوں نہیں جاتے

شعلے ہیں تو کیوں ان کو بھڑکتے نہیں دیکھا
ہیں خاک تو راہوں میں بکھر کیوں نہیں جاتے

آنسو بھی ہیں آنکھوں میں دُعائیں بھی ہیں لب پر
بگڑے ہوئے حالات سنور کیوں نہیں جاتے

فلم : زخمی　　موسیقار : خورشید انور　　گلوکار : مہدی حسن

اِک بھُول سمجھ کر ہم دل کی اُلفت کا زمانہ بھُول گئے
کیا ہم نے کہا تھا کیا تم نے سارا افسانہ بھُول گئے

غم دل کی نشانی چھوڑ آئے
خاموش کہانی چھوڑ آئے

مت پوچھ ہماری نظروں کا!
تھا کون نشانہ بھُول گئے

ہر رات نئی محفل میں رہے

آباد کسی کے دل میں رہے

اِک بار جہاں ہم نے پی لی

پھر وہ میخانہ بھول گئے

اِک پھول پہ ہم کب مرتے ہیں

دم سارے چمن کا بھرتے ہیں

کس کس کی محبّت کا ہم نے

گایا نہ ترانہ بھول گئے

فلم : بھروسہ موسیقار : اے حمید گلوکار : منیر حسین

نندیا روٹھ گئی اکھیئن سے نر س گیا میرا پیار
پھر پردیس نہ جانے دوں گی آجا اِک بار

لوگ دیکھیں نہ تماشہ مری تنہائی کا
نغمہ فریاد میں ڈھل نہ شہنائی کا

رات کٹتی نہیں اے چاند یہ اُن سے کہنا
دن گزرتا ہے تڑپ کر ترے سودائی کا

سب کہیں گے کہ مجھے چھوڑ گئے ہو تنہا
کیسے دیکھوں گی یہ عالم تری رُسوائی کا

ساجنا پیار کیا ہے تو نبھاتے رہنا
دے نہ طعنہ یہ زمانہ تجھے ہرجائی کا

فلم : ماں، بہو اور بیٹا　　موسیقار : حسن لطیف　　گلوکارہ : نورُجہاں

○

نہ شاخ ہی رہی باقی نہ آشیانہ ہے
بہت سکون سے اب گردشِ زمانہ ہے

نبھانے آئے تھے جو رسم دوستی ہم سے
اُنھی کے تیرِ ستم کا یہ دل نشانہ ہے

خموش کیوں ہو، بتاؤ کہاں چلے جائیں
تمھارے در کے سوا اب کہاں ٹھکانہ ہے

فلم: ماں بہو اور بیٹا　　موسیقار: حسن لطیف　　گلوکارہ: نورجہاں

O

اب اور پریشاں دلِ ناشاد نہ کرنا
وہ یاد بھی آئیں تو انھیں یاد نہ کرنا

بے درد زمانے کو ہے ہنس دینے کی عادت
ہر اک سے بیاں درد کی رُو داد نہ کرنا

پھر اشک بہانے کی اجازت بھی نہ ہو گی
دلِ خوُن بھی ہو جائے تو فریاد نہ کرنا

چاہت پہ ہماری کہیں الزام نہ آئے
بھُولے سے کبھی شکوۂ صیّاد نہ کرنا

فلم : ماں بہو اور بیٹا　　موسیقار: حسن لطیف　　گلوکار: مہدی حسن

○

اُس بے وفا نے داغِ تمنّا دیا مجھے
بدلہ مری وفا کا یہ اچھّا دیا مجھے

دُنیا میں اب کہیں بھی محبّت نہیں رہی
آج اُس کی بے رُخی نے یہ سمجھا دیا مجھے

کیوں اُس کے در پہ لے دل بیتاب لے گیا
میں تو کہوں گا تُو نے بھی دھوکا دیا مجھے

گلوکار : مہدی حسن

بھول جاؤ گے تم
کر کے وعدہ صنم
تمہیں دل دیا تو یہ جانا
بھول جاؤ گے تم

درد کا ہے سماں غم کی تنہائی ہے
جس طرف دیکھئے بے کسی چھائی ہے
آج ہر سانس پر ہو کے بے تاب دِل
دھڑکنے لگا تو یہ جانا
بھول جاؤ گے تم

کیسے گزرے گی شب، کیسے ہو گی سحر
اب نہ وہ منزلیں ہیں نہ وہ ہم سفر
دیکھتے دیکھتے رہگزر رہگزر

اندھیرا ہُوا تو یہ جانا
بھُول جاؤ گے تمُ

چاند کو دیکھ کر ہو رہا ہے گماُں
پھُول کے رُخ پہ چھائی ہو جیسے خزاں
مُسکراتا ہوا میری اُمیّد کا

چمن لُٹ گیا تو یہ جانا
بھُول جاؤ گے تم

فلم : سیما　　موسیقار : ماسٹر عنایت حسین　　گلوکار : سلیم رضا

پیار بھرے خوابوں کی مالا پل میں ٹوٹ گئی
کس منزل پہ آ کے مجھ سے قسمت روٹھ گئی

بنا کے میرا نشیمن جلا دیا تُو نے
مری وفا کا مجھے یہ صلا دیا تو نے

کیا تھا عہدِ وفا تُو نے جو محبت میں
مجھے تو یاد ہے اب تک بُھلا دیا تُو نے

فضا اُداس نظر بے قرار دل ویراں
ہر اک چراغ تمنا بجھا دیا تُو نے

زمانہ میری تباہی پہ مسکرائے گا
بھرے جہاں میں تماشہ بنا دیا تُو نے

فلم : دو راستے　　موسیقار: ماسٹر عنایت حسین　　گلوکار: سلیم رضا

چھوڑ میرے یار کوئی اور بات کر

تجھ کو نہیں کچھ بھی خبر

کیا اندھیری شبوں میں ہوتا ہے

کون ہنستا ہے کون روتا ہے

آ تجھ کو زخم دکھاؤں

چہروں سے پردے سرکاؤں

دیکھ یہ رنگ و نور کے سودے

دیکھ دلِ مجبور کے سودے

سمجھ اشارے جان یہ باتیں

کیا کہتی ہیں جاگتی راتیں

پیٹ بھروں کے دیکھ وہ دنگے

اِدھر بیچارے بھوکے ننگے

دیکھ کر دل کا خون ہوتا ہے
کون ہنستا ہے کون روتا ہے

سہمے سہمے لوگ ہیں دیکھو
صدیوں کے یہ روگ ہیں دیکھو
دیکھ سحر بن وہ کٹیائیں
جلتی بجھتی وہ آشائیں
دیکھ دھواں سانسوں میں جاتا
جسم سے جاں کا ٹوٹتا ناطہ
علم جنھیں کرنا تھا حاصل
بیچ رہے ہیں پین و پنسل

کیوں انھی کا نصیب سوتا ہے
کون ہنستا ہے کون روتا ہے

فلم : ہم ایک ہیں   موسیقار : نثار بزمی   گلوکارہ : مہناز

من میں اُٹھی نئی ترنگ

ناچے مورا انگ انگ

پنچھی تیرے سنگ سنگ

من چاہے اُڑ جاؤں

کسی کے ہاتھ نہ آؤں

اے سکھی ناں ناں ناں!

آج میرے جیون میں کیسی رے مچی ہل چل

جیارا مورا دھڑک گیا ہو گئی میں بے کل

جانے کیا ہے یہ اُمنگ

کہتے ہُوئے شرماؤں

کسی کے ہاتھ نہ آؤں!

اے سکھی ناں ناں ناں!

رنگ بھرے نینوا بولی رے نئی بولے

چھُپے چھپے من کے میرے بھید کوئی کھولے

جھُومتی ہوا کے سنگ

بادلوں میں کھو جاؤں

کسی کے ہاتھ نہ آؤں!

اے سکھی ناں ناں ناں!

فلم : ناگ منی — موسیقار : نثار بزمی — گلوکارہ : نُورجہاں۔

موت کا نشّہ

(مشتاق گھنڈور کی فلم "موت کا نشہ" کا گیت)

یہ ہے موت کا نشہ
اسے جو مُنہ لگائے گا
وہ زندگی سے جائے گا

صبح و شام نسلِ نو کا قتلِ عام دیکھیے
موت دے رہا ہے موت کا نظام دیکھیے
جل بُجھی حیا کی شمع اِک دھواں سا رہ گیا
یہ دھواں نہ جانے اور کتنے گھر جلائے گا

یہ ہے موت کا نشہ
اسے جو منہ لگائے گا
وہ زندگی سے جائے گا

زندگی نہ مل سکے گی بار بار سوچ لو!
کر رہے ہو جان موت پر نثار سوچ لو!
سوگوار جن کو چھوڑے جا رہے ہو دہر میں
کون ان کے بوجھ کو تمہارے بعد اُٹھائے گا
یہ ہے موت کا نشہ
اسے جو مُنہ لگائے گا
وہ زندگی سے جائے گا

تیرگی کے تاجروں سے پاک یہ جہاں کرو
بیچتے ہیں یہ جو زہر ان کو بے نشاں کرو
اِس خموش کُشت و خوں کی ختم داستاں کرو
چہرۂ حیات پر یونہی نکھار آئے گا
بے حسی و بے کسی کا دور بیت جائے گا
یہ جہان مسکرائے گا

چل میرے ہمدم سنگ میرے

جہاں ملتے ہیں شام سویرے

مری اُمید بر آئی

ہوئی اب دُور تنہائی

لگی ہے گونجنے اب تو

مرے کانوں میں شہنائی

کرم تُو نے کیا مجھ پر

میں دھرتی سے بنی امبر

پھروں اُڑتی ہواؤں میں

مَیں تیری ساجنا ہو کر

بیتے گا یہ جیون

قدموں میں تیرے

چل میرے ہمدم....

ملی تھی کب خوشی پہلے
تھی غم سے دوستی پہلے
کسے ہم داغ دکھلاتے
نہ تھا اپنا کوئی پہلے
نظر تُونے ملائی کیا
مقدّر میرا جاگ اُٹھّا
محبّت ہوگئی خُود سے
جو تُونے پیار سے دیکھا
چھُٹ گئے سارے
دُکھ کے اندھیرے
ہوں کیوں نہ اس دل میں
خوشیوں کے ڈیرے

چل میرے ہمدم ....

الفتح کے جوانو، کعبے کے پاسبانو
اب وقت آگیا ہے گھر سے قدم نکالو
جاں بازو کامرانو
الفتح کے جوانو

جاگو کہ جاگنے سے تقدیر جاگتی ہے
اُٹھو تمہاری منزل تم کو پکارتی ہے
باطل سے دب کے رہنا توہینِ زندگی ہے
اب دل میں آگ بھر دو، اب ختم رات کر دو
اے صبح کے نشانو
الفتح کے جوانو!

محکوم ہے فلسطیں ہے خاک اپنا جینا
تیروں سے نفرتوں کے چھلنی ہے آج سینہ
اس کا نشاں مٹا دو جس نے ہے چین چھینا
لے کر رہو فلسطیں جھپٹو مثالِ شاہیں
اے عزم کی چٹانو
الفتح کے جوانو

فلم : العاصفہ

غلط ہیں سب یہ فاصلے

یہ دُور کیا قریب کیا

گلے میں اُونچ نیچ کی

یہ میری جاں صلیب کیا

ہم ایک ہیں

ہم ایک ہیں

یہ پھُول رنگ رنگ کے

کنول ہیں ہر اُمنگ کے

جوان ان سے دھڑکنیں

یہ سُر ہیں جلترنگ کے

مگر یہ بات پیار کی
سمجھ سکے رقیب کیا
ہم ایک ہیں
ہم ایک ہیں

یہ رشتے ہیں وہ خُون کے
کبھی نہیں جو ٹوٹتے
ستمگروں سے یہ کہو
دکھائیں ان کو توڑ کے
انھی سے ہیں بندھے ہُوئے
امیر کیا غریب کیا
ہم ایک ہیں
ہم ایک ہیں

فلم : ہم ایک ہیں　　موسیقار : نثار بزمی　　گلوکار : غلام عباس ، مہناز

میرا ایمان محبّت ہے، محبّت کی قسم

ساری دُنیا ترے قدموں پہ نچھاور کر دُوں

چاند تاروں سے مری جاں ترا دامن بھر دُوں

تیرے خوابوں پہ کبھی چھا نہ سکے شامِ اَلم

میرا ایمان محبّت ہے

وہ جہاں ایک جہنّم ہے جہاں تُو نہ ملے

جل کے مر جاؤں جو سایۂ گیسُو نہ ملے

زندگی زہر بھرا جام ہے اب تیرے بغیر

تیری چاہت پہ ہیں قربان مرے لاکھ جنم

میرا ایمان محبّت ہے

مُسکرا جانِ بہاراں کہ سویرا ہو گا!
ختم صدیوں کے رواجوں کا اندھیرا ہو گا!
شب کی تقدیر میں لکھا ہے گُزر ہی جانا
راہ سُورج کی کہاں روک سکے اہلِ ستم

میرا ایمان محبّت ہے

فلم : ناگ منی　　　موسیقار : نثار بزمی　　　گلوکار : مہدی حسن

لو چلی وہ، ڈولی میں اسون کی

دُکھ بن کے آئے کہار

لاگے دُنیا اندھیری

دل جل گیا، آہ لب پر نہ آئی

چاروں طرف درد کی شام چھائی

جائے گا دل سے نہ پیار

روکے زمانہ ھزار

دُکھ بن کے آئے کہار

لاگے دُنیا اندھیری

جو دُکھ ملے ہیں
ہنس کے سہیں ہیں
اس چُپ میں کتنے ہی
طوفاں چھُپے ہیں
سہمی رہے گی پکار
روئے دل بار بار
دُکھ بن کے آئے کہار
لاگے دُنیا اندھیری

فلم : گھر پیارا گھر   موسیقار : نثار بزمی   گلوکار : مہدی حسن

جاگنے والو جاگو مگر خاموش رہو
کل کیا ہوگا کس کو خبر خاموش رہو

کس نے سُنی ہے اس نگری میں دل کی بات
کس پہ ہوا آہوں کا اثر خاموش رہو

رات کے بعد اک رات نئی آجائے گی
اس گھر میں ہوگی نہ سحر خاموش رہو

ظُلم کے پہرے، خوف کے سائے سر پہ ہیں
ہو جائے گی عمر بسر خاموش رہو

فلم : خاموش رہو	موسیقار : خلیل احمد	گلوکارہ : ناہید نیازی

سنگیت نہ جانے

دکھلائے گا کب تک ہمیں

یہ خواب سہانے

سُر تال ہے جیون

لیکن میرے ماحول میں

پاتال ہے جیون

کیوں حُسن کے دُشمن ہوئے

کچھ لوگ پرانے

سنگیت نہ جانے

کب زخم یہ سلے ہیں
نغموں کے عوض ہم کو سدا
اشک ملے ہیں

رویا وہی آیا یہاں
جو پُھول کھلانے
سنگیت نہ جانے

یہ جُرم ہے میرا
میں لیتا ہوں کیوں نام یہاں
پیار سے تیرا
بدلہ مجھے اچھا دیا یہ میری وفا نے
سنگیت نہ جانے

فلم : سازو آواز　　　موسیقار : حسن لطیف　　　گلوکار : مہدی حسن

کیوں کہیں یہ ستم آسماں نے کیے
آسماں سے ہمیں کچھ شکایت نہیں
دُکھ ہمیں جو دیے اِس جہاں نے دیے

چند لوگوں کے ہاتھوں میں ہے زندگی
چھین لیتے ہیں جب چاہتے ہیں خُوشی
اُونچے اُونچے گھروں میں ہے جو روشنی
جل رہے ہمارے لہو کے دِیے

لاکھ چلتی رہے یہ ہوائے ستم
دیپ بجھنے نہ دیں گے محبت کا ہم
دیکھنا بیت جائے گی شامِ الم
جی رہے ہیں یہی آس دل میں لیے

فلم : ساز و آواز　　موسیقار : حسن لطیف　　گلوکارہ : نُورجہاں

بُجھے نہ دل رات کا سفر ہے

رات کا سفر ہے

یہ ناسمجھ لوگ بے خطا ہیں

ہمارے غم کی کسے خبر ہے

رات کا سفر ہے

دکھائیں داغ اپنے کس کو اے جاں

یُونہی لُٹے ہیں ہمارے ارماں!

رہے ہیں تر آنسوؤں سے داماں

یہ غم کا طوفاں ڈگر ڈگر ہے

رات کا سفر ہے

ہنسیں گی سہمی ہوئی نگاہیں
چمک اُٹھیں گی وفا کی راہیں
ہزار ظالم سہی اندھیرا
سحر بھی لیکن قریب تر ہے
رات کا سفر ہے

فلم : گھر پیارا گھر موسیقار : نثار بزمی گلوکار : مجیب عالم

اے شامِ غم بتا کہ سحر کتنی دُور ہے
آنسو نہیں جہاں وہ نگر کتنی دُور ہے

دم توڑتی نہیں ہے جہاں پر کسی کی آس
وہ زندگی کی راہ گزر کتنی دُور ہے

اب کوئی پاسباں نہ کوئی اپنا ہمسفر
منزل ہماری کس کو خبر کتنی دُور ہے

کوئی پکارتا ہے تجھے کب سے اے خُدا
کہتے ہیں تُو ہے پاس مگر کتنی دُور ہے

فلم : پرائی آگ　　موسیقار : خورشید انور　　گلوکار : مہدی حسن

ہمیں یقیں ہے ڈھلے گی اِک دن ستم کی یہ شام اے فلسطیں
اے فلسطیں

ستمگروں کا نشاں نہ ہوگا ہمارا خوں رائیگاں نہ ہوگا!!
شہید ہو کر بھی اپنے لب پہ ہے تیرا ہی نام اے فلسطیں

وطن سے جب تک مٹا نہ لیں گے نشان ہم سامراجیوں کا
قسم محمدؐ کی عظمتوں کی نہ لیں گے آرام اے فلسطیں!

فلم : زرقا
موسیقار : رشید عطرے
گلوکارہ : نسیم بیگم ۔ منیر حسین

اپنے چمن کو جلتا دیکھوں اور خاموش رہوں آخر کیوں

اِس دھرتی پر بہا ہے کتنے انسانوں کا خوں آخر کیوں

ساری زمینوں کو ہیں گھیرے

صدیوں سے خونخوار لیٹرے

عزّت دولت میرے وطن کی

لُوٹ رہے ہیں چند لٹیرے

کب تک یہ بربادی دیکھوں کب تک ضبط کروں آخر کیوں

ہر دل پر ہے دہشت چھائی

کس نے ہے یہ آگ لگائی

دشمن دُور ہے چین سے بیٹھا

لڑتا ہے بھائی سے بھائی

قاتل کو پہچان کے بھی قاتل کا نام نہ لُوں آخر کیوں

ظُلم و ستم کے یہ متوالے

کریں ہیں کیا کیا دھندے کالے

اتنے بے حس اتنے ظالم

نام نبیؐ کا لینے والے

ان کے ہاتھوں ہنستے بستے شہر اُجڑنے دُوں آخر کیوں

میں چور تُو چور چوروں کا ہے یہ جہاں

ہے بات گھاٹے کی ایمانداری یہاں

آجائے گا نگاہ میں کھولے گا جو زُباں

میں چور تُو چور .....

پی کا وطن کا خُون لیٹرے جواں ہوئے

کرنے کو لُوٹ مار اندھیرے جواں ہوئے

دل میں ہے ہر گھڑی خوف سا

دہشت زدہ ہیں شہر تو سہمی ہیں بستیاں

میں چور تُو چور ....

باہر کا چور ہے کوئی اندر کا چور ہے
قطرے کا کوئی، کوئی سمندر کا چور ہے

راہزن بنے ہیں راہنما
کیا کیا لُٹے نہ پُوچھ اُمیدوں کے کارواں
میں چور تُو چور ......

رشوت چلا رہا ہے ہر اک کاروبار دیکھ
فائل پہ بن رہی ہے سڑک بار بار دیکھ
خُون ہے سب کے مُنہ کو لگا
چوروں کے اِس سماج میں انسانیت کہاں
میں چور تُو چور ......

فلم: چوروں کی بارات　　موسیقار: وجاہت عطرے　　گلوکار: اے نیّر

پیسے کی یہ دُنیا ہے پیارے
گاتے ہیں اِسی کے گُن سارے
ہے تمنّا اِس جہاں میں
کوئی دل سے ہمیں پُکارے
پیسے کی یہ دُنیا ہے پیارے

یہ جنگ یہ فساد ہے
پیسے کے واسطے
یہ زندہ مُردہ باد ہے
پیسے کے واسطے
صبح ہے فریب کی
منافقت کی شام
لب پہ دوستی کا نام

کلامِ تازہ

وارث شاہؒ بھٹائیؒ کے نام

وارث شاہ بھٹائی دونوں مِل کر روتے ہیں
اور رکھوالے دیس کے لمبی تان کے سوتے ہیں

ان کے چہرے زرد زرد ہیں انکی آنکھیں ہیں نم نم
اپنے خون پسینے سے جو جیون بوتے ہیں

اک دُوجے کو بُرا بھلا کہنے کے سوا کچھ کام نہیں
کیا سارے جگ میں نیتا ایسے ہی ہوتے ہیں؟

ان کے کھاتے اندر بھی ہیں' انکے کھاتے باہر بھی
لوگو جن لوگوں کے لوٹنے والوں سے سمجھوتے ہیں

میرے تیرے بچّے کو چپڑاسی بھی کب بننا ہے
صدر بنیں گے وُہی' پرانے صدروں کے جو پوتے ہیں

جالبؔ انہی کا نام رہے گا رہتی دنیا تک
اپنے شعر میں جو لوگوں کا دَرد سموتے ہیں

حاجی یوسف کے نام

تیرے لفظوں سے ہیں ایوان لرزاں
تیرے اُشکوں سے ہیں طوفان لرزاں

تیرے مصرعوں میں ایسی سسکیاں ہیں
جسے سُن سُن کے ہیں انسان لرزاں

یہ پاکستان تیرا ہے نہ میرا
اسے کچھ بدخصالوں نے ہے گھیرا

گھرانے چند اس پر ہیں مسلّط
یہاں پر معتبر ہے، ہر لٹیرا

مجھے یہ دکھ ہے میری نظم کوئی
دلوں کو اس طرح چھُوتی نہیں ہے

میں شرمندہ ہوں میرے پیارے یوسفؔ
یہ میں نے نظم کیوں لکھّی نہیں ہے

خوب آزادیٔ صحافت ہے

خوب آزادیٔ صحافت ہے
نظم لکھنے پہ قیامت ہے

دعویٰ جمہوریت کا ہے ہر آن
یہ حکومت بھی کیا حکومت ہے!

دھاندلی دھونس کی ہے پیداوار
سب کو معلوم یہ حقیقت ہے!

خوف کے ذہن و دل پہ سائے ہیں
کس کی عزّت یہاں سلامت ہے!

کبھی جمہوریت یہاں آئے
یہی جالبؔ ہماری حسرت ہے!

وہ دیکھنے مجھے آنا تو چاہتا ہو گا
مگر زمانے کی باتوں سے ڈر گیا ہو گا

اسے تھا شوق بہت مجھ کو اچھا رکھنے کا
یہ شوق اوروں کو شاید بُرا لگا ہو گا

کبھی نہ حدِّ ادب سے بڑھے تھے دیدۂ و دل
وہ مجھ سے کس لئے کسی بات پر خفا ہو گا

مجھے گمان ہے یہ بھی یقین کی حد تک
کسی سے بھی نہ وہ میری طرح مِلا ہو گا

کبھی کبھی تو ستاروں کی چھاؤں وہ بھی
مِرے خیال میں کچھ دیر جاگتا ہو گا

وہ اس کا سادہ و معصوم والہانہ پن
کسی بھی جگ میں کوئی دیوتا بھی کیا ہو گا

نہیں وہ آیا تو جالب گِلہ نہ کر اس کا
نجانے کیا اسے درپیش مسئلہ ہو گا

ملکۂ ترنّم نورُ جہاں کی نذر

نغمہ بھی ہے اُداس تو سُر بھی ہے بے اماں
رہنے دو کچھ تو نورُ اندھیروں کے درمیاں

اک عمر جس نے چین دیا اس جہان کو
لینے دو سُکھ کا سانس اسے بھی سرِ جہاں

تیار کون ہے جو مجھے بازوؤں میں لے
اک یہ نوا نہ ہو تو کہو جاؤں میں کہاں

اگلے جہاں سے مجھ کو یہی اختلاف ہے
یہ صورتیں یہ گیت صدائیں کہاں وہاں

یہ ہے ازل سے اور رہے گا یہ تا ابد
تم سے نہ جل سکے گا ترنّم کا آشیاں

نرس بیبیوں کے لئے

تُو ہے ممتاز بیٹی اور بہن سے
شفا دیتی ہے اپنے دستِ فن سے

تُو آتی ہے مجھے ایسے جگانے
صبا آتی ہے جس طرح چمن سے

جو تُو بیمار کی کرتی ہے خدمت
وہ ملتی ہے نہ دولت نہ دُھن سے

جہاں رکھنا ہے مرہم رکھ رہی ہے
نہیں آتی ہے گھن تجھ کو بدن سے

کمی کرتی ہے تو ماں کی بھی پوری
نہیں ہے کم تیری عظمت وطن سے

مریضوں پر ہی تیرے اتنے احساں
احاطہ ہو نہیں سکتا سخن سے

تیری ہیں نذر چند اشعار بی بی
جو ابھرے ہیں میرے اندر سے من سے

بپا ہے کربلا مہنگائی ہے تخریب کاری ہے
وزارت پھر بھی قائم ہے حکومت پھر بھی جاری ہے

جدھر دیکھو ادھر پانی نہ گھر باقی نہ در باقی
یہاں پر ہم رہا کرتے تھے یہ بستی ہماری ہے

حکومت ذات پر جو خرچ کرتی ہے انہیں دے دے
کہ جن کے دن گراں کٹتے ہیں جن پر رات بھاری ہے

نکلنا ہوگیا دشوار کتنا گھر سے عورت کا
جسے دیکھو وہی عورت کی عزّت کا شکاری ہے

وہاں پر پھیپھڑے میرے سلامت رہ نہیں سکتے
جہاں رہتا ہوں میں جالب وہاں گندھک پیاری ہے

○

حکومت بن رہی ہے یہ جو حاتم' دے کے کچھ پیسے
مکاں بنتا ہے یارو' اتنے پیسوں میں کبھی آساں

کسی سے مل نہ پاؤں' توڑ لوں احباب سے ناطہ
نصیحت تیری چارہ گر' بظاہر ہے بڑی آساں

کبھی طے کرنے پڑتے تھے مراحل کوہ و صحرا کے
مگر اس دَور میں کتنی محبّت ہوگئی آساں

گدایانہ صدائیں لَب پہ اور کشکول ہاتھوں میں
بلندی پر پہنچتی ہے اسی صورت خودی آساں

وہ جن کا شاہ سے دربار سے گہرا تعلّق ہے
نہ جالبؔ ہوسکے گی ان کی اپنی دوستی آساں

گدا یا نہ صدائیں لب پہ اور کشکول ہاتھوں میں
بلندی پر پہنچتی ہے اسی صورت خودی آساں

نہیں کٹتی ہے جن کی اس نگر میں زندگی آساں
انہیں کے واسطے کرتا ہوں پیارے شاعری آساں

وہی لوگوں کے ہے لب پر، اسی کو گنگناتے ہیں!
غزل جو حضرت غالب سے رَو میں ہو گئی آساں!

کلامِ میر پڑھئے اور ذرا مومن کو بھی پڑھئے!
حسیں ہوتی ہے کتنی دیکھئے پھر بات بھی آساں

نہ بزمِ شعر میں جانا، نہ لے کے تمغہ اترانا
بالآخر شاعروں کی میں نے مشکل کر ہی دی آساں!

جو آتا ہے، وہ اپنی ذات ہی سے عشق کرتا ہے
نہیں کرتا غریبوں کی کبھی مشکل کوئی آساں

خود کو نہ کبھی اپنی نگاہوں سے گرایا
صد شکر کہ حکّام کا احساں نہ اُٹھایا

لوگوں سے کیا پیار تو لوگوں نے دیا پیار
ہر صاحبِ دل، پُرسشِ احوال کو آیا

کام آئی کمینوں کے سدا دیس کی دولت
دیکھا نہ کہیں ہم نے مساوات کا سایہ

کھلتا نہیں اغیار کو کس طرح یہ کردار
جالبؔ کسی آمر کو جو خاطر میں نہ لایا

نہ جاں دے دو نہ دل دے دو بس اپنی ایک پل دے دو
زیاں جو کر چکے ہو قوم کا، تم اس کا بِل دے دو

بھلا ہوجائے گا طوفاں زدوں کا اس عنایت سے
جہاں سے پانی آتا ہے وہاں سونے کی سِل دے دو

تمہاری ناخدائی سے یہ کشتی ڈوب جائے گی
خدارا چھوڑدو پیچھا کنارہ مستقل دے دو

بہت تذلیل تو کرلی ہماری زندگانی کی
اجازت موت کی اب ہم کو بن کے رحمدل دو

خلوصِ دل سے اے لوگو سنو پیغام جالبؔ کا
مری برباد بنجر کھیتیوں کو آب و گِل دے دو

تھیٹر کمپنی والا

اختتام کا چھولیتا ہے جب تھیٹر کا شو
تھیٹر کا مالک کہتا ہے ٹھہرو اے لوگو

اس تھیٹر کی اینٹ اینٹ پر لگا ہے رزقِ حلال
میرا پیسہ ڈوب بھی جائے ہوگا نہیں ملال

مجھ کو بچپن ہی سے رہا ہے فن کا بڑا خیال
اسی لئے تو فن کاروں کے بچّے رہا ہُوں پال

ان لفظوں سے روز بڑھاتا ہے اپنی توقیر
لیکن جن کے لگے ہیں پیسے پھرے ہیں بنے فقیر